جاوید احمد غامدی

نبی کی باتیں

[اپنے بچوں کے لیے لکھا گیا]

ہم پیچھے بیان کر چکے ہیں کہ دین قرآن و سنت سے لیا جائے گا۔ پورا دین اِنھی دو چیزوں میں ہے۔ اِن سے باہر کی کوئی چیز دین میں کمی یا اضافہ نہیں کر سکتی۔ ہم اِن کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ اِس میں بعض اوقات کوئی مشکل پیش آجاتی ہے۔ پھر جن معاملات کو ہمارے اجتہاد کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے، اُن میں بھی رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اِس موقع پر صحیح رویہ یہ ہے کہ ہم اُن لوگوں سے پوچھیں یا اُن کی کتابیں دیکھیں جنھیں ہم دین کا عالم سمجھتے ہوں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے نبی تھے، اِس لیے دین کے سب سے پہلے اور سب سے بڑے عالم، بلکہ سب عالموں کے امام بھی آپ ہی تھے۔ دین کے دوسرے عالموں سے الگ آپ کے علم کی ایک خاص بات یہ تھی کہ آپ کا علم بے خطا تھا، اِس لیے کہ اُس میں اگر کوئی غلطی ہو جاتی تھی تو اللہ تعالیٰ اپنی وحی کے ذریعے سے اُس کو درست کر دیتے تھے۔ یہ علم اگر کہیں موجود ہو تو ہر مسلمان یہی چاہے گا کہ سب سے پہلے اِسی سے رہنمائی حاصل کرے۔

ہماری خوش قسمتی ہے کہ یہ علم موجود ہے اور اِس کا ایک بڑا حصہ ہم تک پہنچ گیا ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ علم آپ کے صحابہ نے حاصل کیا تھا، لیکن اِس کو آگے بیان کرنا چونکہ بڑی ذمہ داری کا کام تھا، اِس لیے بعض نے احتیاط برتی اور بعض نے حوصلہ کر کے بیان کر دیا۔ اِس میں وہ چیزیں بھی تھیں جنھیں وہ آپ کی زبان سے سنتے یا آپ کے عمل میں دیکھتے تھے اور وہ بھی جو آپ کے سامنے کی جاتی تھیں اور آپ اُس سے منع نہیں فرماتے تھے۔ یہ سارا علم درحقیقت آپ کی باتیں ہیں۔ بات کو عربی زبان میں حدیث کہتے ہیں۔ اِن کے لیے یہ لفظ اِسی بنا پر اختیار کیا گیا

ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ سب سے پہلے یہ باتیں آپ کے صحابہ نے لوگوں کو سنائیں۔ پھر جن لوگوں نے اُن سے سنیں، اُنھوں نے دوسروں کو سنائیں۔ یہ زبانی بھی سنائی گئیں اور بعض اوقات لکھ کر بھی دی گئیں۔ ایک دو نسلوں تک یہ سلسلہ اِسی طرح چلا، لیکن پھر صاف محسوس ہونے لگا کہ اِن کے بیان کرنے میں کہیں کہیں غلطیاں ہو رہی ہیں اور کچھ لوگ دانستہ اِن میں جھوٹ کی ملاوٹ بھی کر رہے ہیں۔ یہی موقع ہے، جب اللہ کے کچھ بندے اُٹھے اور اُنھوں نے اِن حدیثوں کی تحقیق کرنا شروع کی۔ اِنھیں 'محدثین' کہا جاتا ہے۔ یہ بڑے غیر معمولی لوگ تھے۔ اِنھوں نے ایک ایک روایت اور اُس کے بیان کرنے والوں کی تحقیق کر کے، جس حد تک ممکن تھا، غلط اور صحیح کی نشان دہی کی اور جھوٹ کو سچ سے الگ کر دیا۔ پھر اِنھی میں سے بعض نے ایسی کتابیں بھی مرتب کر دیں جن کے بارے میں بڑی حد تک اطمینان کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اُن میں جو حدیثیں نقل کی گئی ہیں، وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی باتیں ہیں جو روایت کرنے والوں نے زیادہ تر اپنے الفاظ میں بیان کر دی ہیں۔ علم کی زبان میں اِنھیں 'اخبار آحاد' کہتے ہیں۔ اِس سے مراد وہ خبریں ہیں جو اتنے کم لوگوں کے ذریعے سے پہنچیں کہ اُن کے بارے میں یہ کہنا ممکن نہ ہو کہ وہ غلطی نہیں کر سکتے تھے یا کسی جھوٹ پر جمع نہیں ہو سکتے تھے۔

حدیث کی جن کتابوں کا ذکر ہوا ہے، وہ سب اپنی اپنی جگہ اہم ہیں، مگر امام مالک، امام بخاری اور امام مسلم کی کتابیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں اور بہت مستند خیال کی جاتی ہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے علم و عمل، آپ کی سیرت اور آپ کے اسوۂ حسنہ کو جاننے کا سب سے بڑا اور سب سے اہم ذریعہ یہی کتابیں ہیں۔ یہ بڑی تحقیق کے بعد مرتب کی گئی ہیں۔ تاہم اِس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اِن کے مرتب کرنے والوں سے کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ اِس علم کے ماہرین جانتے ہیں کہ اُن سے تحقیق میں غلطیاں بھی ہوئی ہیں۔ اِسی بنا پر وہ برابر اِن کتابوں کو جانچتے پرکھتے رہتے ہیں۔ چنانچہ کسی حدیث کے بیان کرنے والوں میں کوئی بڑی کمزوری دیکھتے ہیں یا اُس کے مضمون میں دیکھتے ہیں کہ کوئی بات قرآن و سنت کے خلاف ہے یا علم و عقل کی مانی ہوئی باتوں کے خلاف ہے تو لوگوں کو بتا دیتے ہیں کہ یہ آں حضرت کی بات نہیں ہو سکتی۔ یہ غلطی سے آپ کی طرف منسوب ہو گئی ہے۔

میرے بچو، تم جانتے ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے پیغمبر تھے۔ خدا نے ہمیں پابند کیا ہے کہ ہم ہر حال میں آپ کی اطاعت کریں۔ لہٰذا آپ کا کوئی حکم یا فیصلہ اگر اِن حدیثوں کے ذریعے سے ہم تک پہنچے تو ہم اُس سے روگردانی

نہیں کر سکتے۔ مسلمان کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اُس کی نسبت پر مطمئن ہو جائیں تو بغیر کسی چون و چرا کے اُس کو مانیں اور اُس پر عمل کے لیے تیار ہو جائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ الانفال

(۶)

(گذشتہ سے پیوستہ)

وَلَوْ تَرٰٓی اِذْ یَتَوَفَّی الَّذِیْنَ کَفَرُوا الْمَلٰٓئِکَۃُ یَضْرِبُوْنَ وُجُوْھَھُمْ وَاَدْبَارَھُمْ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ ﴿۵۰﴾ ذٰلِکَ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْکُمْ وَاَنَّ اللّٰہَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ ﴿۵۱﴾

اگر تم دیکھ پاتے (تو دیکھتے کہ اُس وقت کیا گزر رہی تھی)، جب فرشتے اِن منکروں کی روحیں قبض کر رہے تھے، اِن کے چہروں اور اِن کی پیٹھوں پر مارتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے کہ اب چکھو جلنے کا عذاب۔ یہ اُس کا بدلہ ہے جو تم نے اپنے ہاتھوں آگے بھیجا تھا اور اِس لیے ہے کہ اللہ اپنے بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں ہے[۹۱]۔ ۵۰-۵۱

---

۹۱ چنانچہ ٹھیک وہی معاملہ کر رہا ہے جس کے تم اپنے کرتوتوں کے نتیجے میں مستحق ہو چکے ہو۔ آیت میں 'اَنَّ اللّٰہَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ' کے الفاظ ہیں۔ اِن میں مبالغہ پر جو نفی آئی ہے، وہ مبالغہ فی النفی کے لیے ہے۔ ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔ یہ وہی بات ہے جو دوسرے مقامات میں 'اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ'* (بے شک،

---

* النساء ۴: ۴۰۔

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ
اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۵۲﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا
عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۳﴾ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ
وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ

اِن کے ساتھ وہی معاملہ ہوا ہے جو آل فرعون اور اُن سے پہلے کے لوگوں کے ساتھ پیش آیا تھا۔ اُنھوں نے اللہ کی آیتوں کا انکار کر دیا تو اللہ نے اُن کے گناہوں پر اُنھیں پکڑ لیا[۹۲]۔ بے شک، اللہ قوی ہے، وہ سخت سزا دینے والا ہے۔ یہ اِس وجہ سے ہوا کہ اللہ کسی نعمت کو جو اُس نے کسی قوم کو عطا کی ہو، اُس وقت تک نہیں بدلتا، جب تک وہ اپنے آپ میں تبدیلی نہ کریں۔ (نیز) اِس وجہ سے کہ اللہ سمیع و علیم ہے[۹۳]۔ وہی ہوا ہے جو آل فرعون اور اُن سے پہلے کے لوگوں کے ساتھ پیش آیا تھا۔ اُنھوں نے اپنے پروردگار کی نشانیوں کو جھٹلایا تو (بالآخر) اُن کے گناہوں کی پاداش میں ہم نے اُنھیں ہلاک کیا

اللہ ذرے کے برابر بھی کسی پر ظلم نہیں کرتا) اور اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا* (بے شک، اللہ لوگوں پر ذرا بھی ظلم نہیں کرتا) کے الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔ اِس اسلوب کی مثالیں قرآن مجید اور کلام عرب، دونوں میں موجود ہیں۔

۹۲ اشارہ ہے اُن سزاؤں کی طرف جو پے در پے اُن پر نازل ہوئیں تاکہ وہ متنبہ ہوں اور پیغمبر کی بات سننے کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ بدر کے موقع پر قریش کو جو کچھ پیش آیا، اُس کی نوعیت بھی یہی تھی۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ اِن کے ساتھ وہی معاملہ ہوا ہے جو فرعون والوں اور اُن سے پہلے کے لوگوں کو پیش آیا تھا۔

۹۳ مطلب یہ ہے کہ خدا کا عذاب اندھے کی لاٹھی نہیں ہے۔ وہ تمام تر خدا کے سمع و علم پر مبنی ہوتا ہے۔ چنانچہ کسی قوم کو سرفرازی کے لیے منتخب کر لینے کے بعد وہ جب اُسے تباہی کے حوالے کرتا ہے تو اُس کے کرتوتوں کی بنیاد پر کرتا ہے۔ قوموں کے عزل و نصب سے متعلق یہ خدا کی غیر متبدل سنت ہے۔ بنی اسرائیل (۱۷) کی آیت ۵۸ میں فرمایا ہے کہ خدا یہ معاملہ دنیا کی ہر قوم کے ساتھ کر رہا ہے اور قیامت تک کرتا رہے گا۔ رسولوں کی بعثت کے بعد، البتہ یہ بالکل مشہود ہو جاتا ہے۔ اُن کی طرف سے اتمام حجت کے باوجود جب کوئی قوم آیات الٰہی کو جھٹلا دیتی ہے تو یہ اِس

* یونس ۱۰: ۴۴۔

وَكُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۵۴﴾
اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۵﴾ اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ
مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۶﴾ فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي

اور فرعون کے لوگوں کو غرق کر دیا[۹۴]۔ یہ سب ظالم لوگ تھے۔ ۵۲-۵۴

یقیناً اللہ کے نزدیک بدترین جانور وہ لوگ ہیں جنھوں نے انکار کر دیا ہے، پھر کسی طرح ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں[۹۵]۔ (بالخصوص وہ لوگ) جن سے تم نے عہد لیا، پھر ہر مرتبہ وہ اپنا عہد توڑ دیتے ہیں اور ذرا نہیں ڈرتے (کہ اِس کا نتیجہ کیا ہوگا)[۹۶]۔ سو اِنھیں لڑائی میں پاؤ تو اِن کو ایسی مار مارو کہ جو اِن کے

بات کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ آخری درجے میں بگڑ چکی ہے، لہٰذا اِسی درجے میں ہلاکت اور تباہی کے حوالے کر دی جاتی ہے۔

۹۴؎ یعنی تنبیہات سے آگے اب وہ نوبت بھی آ گئی ہے جو پہلی قوموں کے معاملے میں آتی رہی ہے کہ وہ خدا کی کھلی ہوئی نشانیوں کو بھی جھٹلا دیتی تھیں۔ بدر میں خدا کے فرقان کو دیکھ لینے کے بعد قریش نے یہی کیا ہے، اِس لیے اب اِس کا نتیجہ بھی بھگتنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ فرعون اور اُس کے لشکروں کے لیے اِس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ خدا نے اُنھیں غرق کر دیا تھا۔

اِس تشریح سے واضح ہے کہ 'كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ' کے الفاظ اِن آیتوں میں اگرچہ دو مرتبہ آئے ہیں، مگر یہ تکرار کے لیے نہیں آئے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''... یہ تکرار نہیں ہے، بلکہ دونوں جگہ دو باتیں بتائی گئی ہیں۔ پہلے یہ بتایا کہ یہ اُسی نوع کی تنبیہ ہے جس نوع کی تنبیہ فرعون اور دوسری قوموں کو کی گئی۔ پھر یہ بتایا کہ اگر اِس تنبیہ سے اِنھوں نے فائدہ نہ اٹھایا تو بالآخر اِن پر بھی اُسی طرح فیصلہ کن عذاب آ جائے گا، جس طرح اُن قوموں پر آیا۔'' (تدبر قرآن ۳/۴۹۷)

۹۵؎ اِس لیے کہ انسان اُسی وقت تک انسان ہے، جب تک وہ سوچنے سمجھنے اور علم و عقل کی روشنی میں فیصلے کرنے کی صلاحیت سے بہرہ یاب ہے۔ یہ صلاحیت ختم ہو جائے تو اُس میں اور جانوروں میں کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا۔ آیت میں 'شَرَّ الدَّوَآبِّ' کے الفاظ آئے ہیں، اِن میں جو زور اور شدت ہے، اُس کی وضاحت پیچھے آیت ۲۲ کے تحت ہو چکی ہے۔

الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿٥٧﴾ وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ
خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ ﴿٥٨﴾

پیچھے ہیں[97]، اُن کو بھی تتر بتر کر دو تاکہ وہ سبق حاصل کریں۔ (تم لوگ، البتہ ہر حال میں عہد کی پابندی کرو) اور اگر کسی قوم سے بدعہدی کا اندیشہ ہو تو اُن کا عہد اُسی طرح برابری کے ساتھ[98] اُن کے آگے پھینک دو۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ بدعہدوں کو پسند نہیں کرتا[99]۔ ۵۵-۵۸

۹۶؎ یہ اشارہ یہود اور بعض دوسرے قبائل کی طرف ہے جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمانے کے بعد حسن جوار اور باہمی تعاون اور مددگاری کے معاہدے کر لیے تھے۔ لیکن جس طرح کے حالات کے لیے یہ معاہدے کیے گئے تھے، وہ جب پیش آتے تو یہ کبھی اُن کی پاس داری نہیں کرتے تھے، بلکہ ہمیشہ اُنھیں توڑ دیتے تھے۔

۹۷؎ یعنی لڑائی کے لیے ابھی سامنے نہیں آئے، مگر پیچھے بیٹھے ہوئے پر تول رہے ہیں۔

۹۸؎ اصل میں 'عَلٰى سَوَآءٍ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن سے کیا مراد ہے؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''...'عَلٰى سَوَآءٍ' کا مفہوم یہ ہے کہ اُنھی کے برابر اقدام تم بھی کرنے کے مجاز ہو۔ اِس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے نہیں دینا چاہیے، بلکہ جواب ہم وزن ہونا چاہیے۔ بعض لوگوں نے اِس سے یہ لازم قرار دیا ہے کہ ختم معاہدہ کی اطلاع فریق ثانی کو دے دینی چاہیے۔ اُن کی اِس بات کی کوئی دلیل اِن الفاظ میں مجھے نظر نہیں آتی۔ البتہ یہ بات مستنبط ہوتی ہے کہ محض فرضی اندیشہ کسی معاہدے کو کالعدم قرار دینے کے لیے کافی نہیں ہے، بلکہ عملاً اُس کی خلاف ورزی کا اظہار ہوا ہو۔ اول تو یہاں 'تَخَافَنَّ' کا جو فعل استعمال ہوا ہے، اُس میں خود تاکید ہے۔ دوسرے 'عَلٰى سَوَآءٍ' کی قید بھی اِن کو نمایاں کر رہی ہے۔'' (تدبر قرآن ۳/۴۹۹)

۹۹؎ یعنی جب اللہ پسند نہیں کرتا تو اہل ایمان کو بھی پسند نہیں کرنا چاہیے۔

[باقی]

محمد رفیع مفتی

رسول اللہ کے موذن کی پکار پر لبیک کہنے کا لزوم

عَن أبی هُرَیْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَدَ نَاسًا فی بَعْضِ الصَّلَوَاتِ فقال لقد هَمَمْتُ أَنْ آمُرَ رَجُلًا يُصَلِّي بِالنَّاسِ ثُمَّ أُخَالِفَ إلى رِجَالٍ يَتَخَلَّفُونَ عنها فَآمُرَ بِهِمْ فَيُحَرِّقُوا عليهم بِحُزَمِ الْحَطَبِ بُيُوتَهُمْ وَلَوْ عَلِمَ أَحَدُهُمْ أَنَّهُ يَجِدُ عَظْمًا سَمِينًا لَشَهِدَهَا يَعْنِي صَلَاةَ الْعِشَاءِ. (مسلم، رقم ۱۴۸۱)

ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لوگوں کو نمازوں میں موجود نہ پایا تو فرمایا کہ میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ میں ایک آدمی کو حکم دوں کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائے پھر ان آدمیوں کی طرف جاؤں جو نماز سے پیچھے رہ گئے ہیں پھر میں لکڑیاں جمع کروا کے ان کے گھروں کو جلا ڈالنے کا حکم دوں۔ (اپنے دنیوی فائدں کے حوالے سے اِن کی حالت یہ ہے کہ) اگر ان میں سے کسی کو معلوم ہو جائے کہ اُسے (عشاء کی نماز میں) گوشت سے پُر ہڈی ملے گی تو وہ اس نماز میں ضرور حاضر ہوگا۔

نماز باجماعت خدا کی جاری کردہ سنت ہدایت

عَنْ عبد اللّٰہِ قال من سَرَّہُ أَنْ یَلْقَی اللّٰہَ غَدًا مُسْلِمًا فَلْیُحَافِظْ علی هَؤُلَاءِ الصَّلَوَاتِ حَیْثُ یُنَادَی بِهِنَّ فإن اللّٰہَ شَرَعَ لِنَبِیِّکُمْ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سُنَنَ الْهُدَی وَإِنَّهُنَّ من سُنَنِ الْهُدَی وَلَوْ أَنَّکُمْ صَلَّیْتُمْ فی بُیُوتِکُمْ کما یُصَلِّی هذا الْمُتَخَلِّفُ فی بَیْتِہِ لَتَرَکْتُمْ سُنَّةَ نَبِیِّکُمْ وَلَوْ تَرَکْتُمْ سُنَّةَ نَبِیِّکُمْ لَضَلَلْتُمْ وما من رَجُلٍ یَتَطَهَّرُ فَیُحْسِنُ الطُّهُورَ ثُمَّ یَعْمِدُ إلی مَسْجِدٍ من هذہ الْمَسَاجِدِ إلا کَتَبَ اللّٰہ لہ بِکُلِّ خَطْوَةٍ یَخْطُوهَا حَسَنَةً وَیَرْفَعُهُ بها دَرَجَةً وَیَحُطُّ عنه بها سَیِّئَةً وَلَقَدْ رَأَیْتُنَا وما یَتَخَلَّفُ عنها إلا مُنَافِقٌ مَعْلُومُ النِّفَاقِ وَلَقَدْ کان الرَّجُلُ یؤتی بِہِ یُهَادَی بین الرَّجُلَیْنِ حتی یُقَامَ فی الصَّفِّ. (مسلم، رقم ۱۴۸۸)

عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جو آدمی یہ چاہتا ہو کہ وہ کل اسلام کی حالت میں اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان ساری جگہوں پر نمازوں کی حفاظت کرے، جہاں سے انھیں پکارا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے تمھارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہدایت کے طریقے متعین کر دیے ہیں اور یہ نمازیں بھی ہدایت کے طریقوں میں سے ہیں اور اگر تم اپنے گھروں میں نماز پڑھو جیسا کہ یہ پیچھے رہنے والا اپنے گھر میں پڑھتا ہے تو پھر تم نے اپنے نبی کے طریقے کو چھوڑ دیا اور اگر تم نے نبی کے طریقے کو چھوڑ دیا تو پھر تم گمراہ ہو گئے۔ کوئی آدمی بھی ایسا نہیں جو اچھی طرح سے طہارت حاصل کرے پھر ان مسجدوں میں سے کسی مسجد کی طرف جائے، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کے لئے ہر قدم پر ایک نیکی لکھتا، ایک درجہ بلند کرتا اور اُس کے ایک گناہ کو مٹا دیتا ہے۔ ہم نے (دور نبوی میں) دیکھا ہے کہ اُس منافق کے سوا، جس کا نفاق معلوم معروف ہوتا، کوئی بھی نماز سے پیچھے نہ رہتا اور یہ

(بھی دیکھا ہے) کہ نماز کے لیے ایک شخص کو دو آدمیوں کا سہارا دے کر لایا جاتا، حتیٰ کہ اُسے صف میں کھڑا کر دیا جاتا تھا۔

باجماعت نماز کی فضیلت

عن عبد اللّٰہِ بن عُمَرَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قال صَلَاۃُ الْجَمَاعَۃِ تَفْضُلُ صَلَاۃَ الْفَذِّ بِسَبْعٍ وَعِشْرِینَ دَرَجَۃً. (بخاری، رقم ۶۴۵۔ مسلم، رقم ۱۴۷۷)

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جماعت کے ساتھ نماز اکیلے نماز پڑھنے سے ستائیس درجہ زیادہ فضیلت رکھتی ہے۔

فجر ظہر اور عشاء کی نمازوں کی فضیلت

عن أبی ہُرَیْرَۃَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قال ....: لو یَعْلَمُ الناس ما فی النِّدَاءِ وَالصَّفِّ الْأَوَّلِ ثُمَّ لم یَجِدُوا إلا أَنْ یَسْتَہِمُوا لَاسْتَہَمُوا علیہ وَلَوْ یَعْلَمُونَ ما فی التَّہْجِیرِ لَاسْتَبَقُوا إلیہ وَلَوْ یَعْلَمُونَ ما فی الْعَتَمَۃِ وَالصُّبْحِ لَأَتَوْہُمَا وَلَوْ حَبْوًا. (بخاری، رقم ۶۵۳، ۶۵۴۔ مسلم، رقم ۹۸۱)

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ....: اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ اذان دینے اور پہلی صف میں شریک ہونے کا ثواب کتنا ہے اور پھر اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ ہو کہ قرعہ ڈالا جائے تو لوگ ان کے لیے قرعہ ہی ڈالا کریں۔ اور اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ ظہر

کی نماز کے لیے جانے میں کیا ثواب ہے تو اس کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کریں اور اگر یہ جان جائیں کہ عشاء اور صبح کی نماز کا کیا ثواب ہے، تو اِن کے لیے سرینوں پر گھسٹتے ہوئے بھی آئیں۔

عَنُ عبدِ الرحمٰن بن أبی عَمُرَۃَ قال دَخَلَ عُثُمَانُ بن عَفَّانَ الُمَسُجِدَ بَعُدَ صَلَاۃِ الُمَغُرِبِ فَقَعَدَ وَحُدَہُ فَقَعَدُتُ إلیہ فَقَالَ یا بُنَ أَخِی سمعتُ رَسُولَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیُہِ وَسَلَّمَ یَقُولُ مَنُ صَلَّی الُعِشَاءَ فی جَمَاعَۃٍ فَکَأَنَّمَا قام نِصُفَ اللَّیُلِ وَمَنُ صلی الصُّبُحَ فی جَمَاعَۃٍ فکأنَّمَا صلی اللَّیُلَ کُلَّہُ. (مسلم، رقم ۱۴۹۱)

عبدالرحمٰن بن ابوعمرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ مغرب کی نماز کے بعد مسجد میں داخل ہوئے اور اکیلے بیٹھ گئے تو میں بھی ان کے ساتھ بیٹھ گیا، انھوں نے فرمایا اے میرے بھتیجے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس آدمی نے عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی تو گویا اس نے آدھی رات قیام کیا اور جس آدمی نے صبح کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی تو گویا کہ اس نے ساری رات قیام کیا۔

پنج وقتہ نمازوں میں خواتین کی حاضری کی گنجایش

عن بن عُمَرَ رضی اللّٰہ عنہما عن النبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیُہِ وَسَلَّمَ قال إذا اسُتَأُذَنَکُمُ نِسَاؤُکُمُ بِاللَّیُلِ إلی الُمَسُجِدِ فَأُذَنُوا لَھُنَّ. (بخاری، رقم ۸۶۵، ۸۷۳۔ مسلم، رقم ۹۹۰)

ابن عمر رضی اللہ عنہما نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ اگر تمھاری

بیویاں تم سے عشاء کی نماز کے لیے مسجد میں آنے کی اجازت مانگیں تو تم لوگ انھیں اس کی اجازت دے دیا کرو۔

پنج وقتہ نمازوں کے حوالے سے خواتین کے لیے ترغیب

عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ زوجِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ خَيْرُ مَسَاجِدِ النِّسَاءِ قَعْرُ بُيُوتِهِنَّ. (ابن خزیمہ، رقم ۱۶۸۳)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ آپ نے فرمایا: عورتوں کے لیے نماز پڑھنے کی بہترین جگہیں اُن کے گھروں کے اندرونی حصے ہیں۔

محمد وسیم اختر مفتی

سمیہ رضی اللہ عنہا

[''سیر وسوانح'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔اس
میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

حضرت یاسر بن عامر عنسی یمن کے رہنے والے تھے، اپنے گم شدہ بھائی کو تلاش کرتے ہوئے مکہ آئے۔ان کے دو دوسرے بھائی حارث اور مالک ان کے ساتھ تھے۔ یہ دونوں تو واپس چلے گئے، لیکن حضرت یاسر کو مکہ ایسا بھایا کہ وہیں بس گئے۔انھوں نے قبائلی رواج کے مطابق ابوحذیفہ بن مغیرہ مخزومی کے ساتھ جینے مرنے کا حلف اٹھالیا۔ابو حذیفہ نے اپنی باندی سمیہ بنت خباط رضی اللہ عنہا (یا خیاط) سے ان کی شادی کر دی۔ابن اسحاق کی شاذ روایت کے مطابق سمیہ رضی اللہ عنہا کے والد کا نام مسلم اور دادا کا لخم تھا۔جب عمار پیدا ہوئے تو ابوحذیفہ نے نومولود عمار کو آزاد کر دیا، لیکن یاسر اور عمار آخری وقت تک اسی کے ساتھ رہے۔ابوحذیفہ کی وفات بعثت نبوی سے پہلے ہوئی۔یاسر کے دو بیٹے اور تھے، عبداللہ اور حریث، حریث دور جاہلیت میں قتل ہو گئے تھے۔

مکہ نور اسلام سے منور ہوا تو حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کے خاندان نے ایمان قبول کرنے اور اس کا اظہار کرنے میں سبقت کی۔باندی ہونے کے باوجود حضرت سمیہ روشن دل و دماغ کی مالک تھیں۔اسلام کی طرف سبقت کرنے والے مسلمانوں، السابقون الاولون میں ان کا ساتواں نمبر تھا۔تب نبی صلی اللہ علیہ وسلم دار ارقم میں منتقل ہو چکے تھے۔ عبداللہ بن مسعود کی روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر، عمار، سمیہ، صہیب، حضرت بلال اور مقداد اپنے اسلام کا اظہار کرنے والے پہلے سات نفوس تھے۔آپ کی حفاظت آپ کے چچا ابوطالب نے کی، ابوبکر کو ان کی قوم نے بچایا، باقی پانچوں کو مشرکین لوہے کی زرہیں پہنا کر تپتی دھوپ میں بٹھا دیتے۔غلام ہونے کی وجہ سے

ان کا دفاع کرنے والا کوئی نہ تھا۔ان میں سے کوئی نہ تھا جس نے مشرکین کی بات نہ مانی، بلال ہی تھے جنھوں نے اللہ کی راہ میں اپنی جان کی پروا نہ کی، ان کی قوم کو بھی ان کا خیال نہ ہوا۔کافروں نے ان کو بچوں کے حوالے کر دیا، وہ انھیں پکڑ کر مکہ کی گھاٹیوں میں گھومے پھرے، وہ ''اللہ ایک ہے''، ''اللہ ایک ہے'' کی صدا لگاتے رہے۔(مسند احمد: ۳۸۳۲، ابن ماجہ: ۱۵۰) اس روایت میں ساتواں نام مقداد بن اسود کا ہے جب کہ ابن سعد کی روایت میں جو جریر سے نقل ہوئی ہے مقداد کی بجائے خباب کا ذکر ہے۔راوی کی یہ بات کہ بلال کے علاوہ سزائیں جھیلنے والے ہر اولوالعزم نے مشرکوں کی مانگ پوری کی، یعنی بظاہر کفریہ کلمات کہہ کر تقیہ سے کام لیا، سیرت سمیہ کے مطالعے سے غلط ثابت ہو جاتی ہے تاہم عمار بن یاسر کی سوانح پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ضرور اس زمرہ میں شامل ہوئے۔

قبیلۂ بنومغیرہ نے اپنی باندی سمیہ کو طرح طرح کی ایذائیں دیں، لیکن انھوں نے عمر رسیدہ اور ضعیف ہونے کے باوجود صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا۔سمیہ کے استقلال کو دیکھ کر مشرکین غصے سے پھٹے پڑتے۔سیدنا عثمان بتاتے ہیں، ایک بار میں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے ریگستان گئے جہاں عمار اور ان کے والدین پر تشدد کیا جا رہا تھا۔یاسر نے التجا کی، کیا یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا؟ آپ نے جواب فرمایا، 'صبرًا یاآل یاسر، ان موعدکم الجنة'۔ آل یاسر صبر سے چپکے رہو، تم سے جنت کا وعدہ ہے۔(مستدرک حاکم: ۵۶۴۶) پھر دعا فرمائی، 'اللّٰھم لا تعذب احدًا من آل یاسر بالنار'۔اے اللہ! آل یاسر میں سے کسی کو دوزخ کی سزا نہ دینا۔جسمانی سزائیں دینے کے علاوہ اہل مکہ کو مستضعفین کے ساتھ لین دین کرنے سے منع کر دیا گیا۔قریش کے تشدد سے سمیہ کے شوہر یاسر کی شہادت ہوئی تو ان کا ایمان اور پختہ ہو گیا۔تب ابوحذیفہ کے بیٹوں نے سمیہ کو اپنے چچا ابوجہل کی تحویل میں دے دیا۔وہ اہل ایمان کو ایذا پہنچانے اور تنگ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔سمیہ اسے نظر حقارت سے دیکھتیں تو وہ غصے سے پاگل ہو جاتا۔ایک رات ابوجہل نے سمیہ کو بہت برا بھلا کہا اور ان کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خوب گالیاں دیں۔اس نے یہ بھی کہا، تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اس لیے ایمان لائی ہو، کیونکہ وہ (معاذ اللہ) تمھاری خوب صورتی پر فدا ہیں۔سمیہ نے ابوجہل کو لعن طعن کی اور سخت باتیں کہیں۔اس کی سرکشی اور طغیان نے زور مارا، اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا بھالا سمیہ کے پیٹ کے نچلے حصے میں دے مارا۔سمیہ اسی وقت تاریخ اسلام کی پہلی شہید کے منصب پر فائز ہوئیں۔آخری دموں میں اشھد ان لا الٰہ الا اللہ وان محمداً رسول اللہ (میں گواہی دیتی ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں) کے کلمات ان کی زبان پر جاری تھے۔یہ روایت بھی ہے کہ ابوجہل نے سمیہ کی ٹانگیں رسی سے باندھ کر کھینچیں۔

ابن عبدالبراورابن اثیر نے ابن قتیبہ کی اس بات کو جسے بعد میں ذہبی نے بھی اختیار کیا غلط اور وہم محض قرار دیا ہے کہ یاسر کی شہادت کے بعد سمیہ حارث بن کلدہ کے رومی غلام یاسر ازرق کے نکاح میں آئیں اور سلمہ بن یاسر نے جنم لیا۔ان کا کہنا ہے کہ یاسر ازرق کا نکاح ثانی سمیہ ام زیاد سے ہوا تھا جو حارث بن کلدہ کی باندی تھی تو سلمہ بن ازرق عمار نہیں، بلکہ زیاد کا سوتیلا بھائی ہوا۔

سمیہ کی شہادت ہجرت نبوی سے سات سال پہلے ۶۱۵ء میں ہوئی۔ بعثت نبوی کے ابتدائی دور میں محض ایمان قبول کرنے کی پاداش میں انھیں شہید کر دیا گیا۔ان کے بیٹے عمار کو بھی تپتی دھوپ میں لٹا کر، ان کے سینے پر بھاری پتھر رکھ کر یا پانی میں غوطے دے کر ایذا دی جاتی رہی۔ انھیں کہا گیا، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو گالیاں دے دو، لات و عزیٰ کو بھلا کہہ دو تو ہم تجھے چھوڑ دیتے ہیں۔شدت تکلیف سے عاجز آ کر انھوں نے یہ سب کہہ دیا، پھر نبئ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس روتے روتے آئے۔آپ نے سوال فرمایا، تم اپنے دل کو کس کیفیت میں پاتے ہو؟ جواب دیا، میں اسے ایمان پر مطمئن پاتا ہوں۔فرمایا، دوبارہ ایسی صورت حال پیش آئے تو پھر یہی کچھ کرنا۔اس موقع پر یہ ارشاد ربانی نازل ہوا:

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ إِيْمَانِهٖٓ إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ. (سورۂ نحل ۱۰۶:۱۶)

''جس شخص نے ایمان لانے کے بعد اللہ کا انکار کیا ، وہ نہیں جو کفر پر زبردستی مجبور کیا گیا، اس حال میں کہ اس کا دل ایمان پر مطمئن تھا بلکہ وہ جس نے شرح صدر کے ساتھ کفر کا ارتکاب کیا تو ایسے لوگوں پر اللہ کا غضب ٹوٹے گا اور ان کو بڑا سخت عذاب ملے گا۔''

جس وقت سمیہ کی شہادت ہوئی، اہل ایمان پر بڑا کٹھن وقت تھا اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دے دی۔آپ کی دختر رقیہ اور آپ کے داماد عثمان کی قیادت میں مسلمانوں کا پہلا دس رکنی قافلہ کشتی کے ذریعے حبشہ روانہ ہو گیا۔

حیات نبوی میں سمیہ کا ذکر خیر منقطع نہ ہوا، کیونکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم عمار کو ابن سمیہ کہہ کر پکارتے۔عبداللہ بن مسعود بتاتے ہیں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا، جب لوگ باہم جھگڑیں گے، ''ابن سمیہ (عمار بن یاسر) حق کا ساتھ دیں گے۔'' ابن مسعود ہی کی روایت کردہ دوسری حدیث یوں ہے، ''ابن سمیہ کو جب بھی دو باتوں میں سے ایک چننے کو کہا گیا، انھوں نے آسان تر (صحیح تر) کا انتخاب کیا۔'' (ترمذی: ۳۷۹۹، ابن ماجہ: ۱۴۸، مستدرک حاکم: ۵۶۶۴) ہجرت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ پہنچے ہی تھے کہ عمار نے کہا، ہمیں کوئی ایسی جگہ بنانی

چاہیے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آرام کر سکیں اور نماز ادا کریں۔ پھر انھوں نے چند پتھر اکٹھے کیے اور مسجد قبا تعمیر کی۔ وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے مسجد بنائی اور اس میں نماز پڑھی۔ (مستدرک حاکم: ۵۶۵۵) اس موقع پر آپ نے فرمایا، ''تمھارے اوپر بڑا افسوس ہے، ابن سمیہ! (دوسری روایت: خوش ہو جاؤ، عمار!) تجھے ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔'' (مسلم: ۷۴۲۶، ترمذی: ۳۸۰۰، مستدرک حاکم: ۵۶۶۰) جنگ بدر کے دن ابوجہل جہنم واصل ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمار سے فرمایا، ''اللہ نے تمھاری ماں کے قاتل کو اس کے انجام تک پہنچا دیا ہے۔''

مطالعۂ مزید: الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ابن عبدالبر)، الکامل فی التاریخ (ابن اثیر)، اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابۃ (ابن اثیر)، سیر اعلام النبلا، ترجمۃ عمار (ذہبی)، الاصابہ فی تمییز الصحابۃ (ابن حجر)، نساء مبشرات بالجنۃ (احمد خلیل جمعہ)، Wikipedia۔

الطاف احمد اعظمی

تصورعبادت

[یہ مصنف کی طبع شدہ کتاب ''اسلامی عبادات: تحقیقی مطالعہ'' کا ایک جزو ہے۔قارئین ''اشراق'' کے افادے کے لیے اس کتاب کے جملہ مباحث بالاقساط شائع کیے جا رہے ہیں۔]

—۲—

اسلام میں ایک عبادت گزار سے جہاں یہ مطلوب ہے کہ وہ اپنے اعضاء و جوارح سے خدا کے سامنے عجز و تذلل کا اظہار کرے، جسے عرف عام میں پرستش سے تعبیر کیا جاتا ہے، وہاں اس سے یہ بھی مطلوب ہے کہ وہ معاملات زندگی میں دل کی مکمل رضا کے ساتھ حتی المقدور خدا کی فرماں برداری کرے اور اس کی نافرمانی سے بچے۔ بندے کے اس عابدانہ رویے کا نام قرآن مجید کی زبان میں تقویٰ ہے۔ عبادت اور تقویٰ میں گہرا رشتہ ہے۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اس ربط و تعلق کو واضح کر دیا گیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوهُ. (سورۂ نوح ۷۱:۳) ''یہ کہ اللہ کی بندگی کرو اور اس کی نافرمانی سے بچو۔''

دوسری جگہ فرمایا ہے:

وَإِبْرَاهِيمَ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوهُ. (سورۂ عنکبوت ۲۹:۱۶) ''اور ابراہیم کہ جب اس نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ اللہ کی بندگی کرو اور اس کی نافرمانی سے بچو۔''

ایک اور مقام پر ارشاد ہوا ہے:

وَإِنَّ هٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُونِ. (سورۂ مومنون ۲۳:۵۲)

اس آیت میں ''فاعبدون'' کی جگہ ''فاتّقون'' (پس میری نافرمانی سے بچو) کے جملہ نے عبادت کے مفہوم

کوکھول دیا ہے کہ وہ دل سے خدا کی اطاعت وفرماں برداری کا نام ہے۔

اخلاص عبادت

اسلامی عبادت کے مفہوم میں جس طرح برضا ورغبت خدائے واحد کی اطاعت و بندگی کا مفہوم، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، بنیادی حیثیت رکھتا ہے اسی طرح ضروری ہے کہ یہ اطاعت و بندگی خالص ہو، اس میں کسی طرح کی آمیزش نہ ہو۔ قرآن کی اصطلاح میں اس بے آمیز عبادت کو ''اخلاص دین'' کہا گیا ہے۔ ارشاد ہوا ہے:

إِنَّـا أَنْـزَلْـنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰـهَ مُـخْـلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ . أَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ . (سورۂ زمر:۲)

''بے شک ہم نے یہ کتاب تمھاری طرف مطابق حق اتاری ہے تو تم اللہ ہی کی بندگی کرو اطاعت کو اسی کے لیے خالص کرتے ہوئے۔ سن لو کہ خالص اطاعت کا سزاوار اللہ ہی ہے۔''

دوسری جگہ فرمایا ہے:

وَمَـا أُمِرُوْا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ . (سورۂ بینہ:۵)

''ان کو بس یہی حکم دیا گیا تھا کہ وہ اللہ کی بندگی کریں، اطاعت کو اسی کے لیے خاص کرتے ہوئے، بالکل یکسو ہو کر۔''

اخلاص کے لفظی معنی چھانٹ کر الگ کر دینے کے ہیں یعنی اگر کسی چیز میں کوئی اور شے خارج سے آ کر شامل ہو گئی ہو تو اس کو اصل شے سے جدا کر دینا اخلاص ہے۔ 'خلص الماء من الکدر' کا مطلب ہے، پانی کا میل کچیل سے پاک وصاف ہونا۔ اسی سے لفظ خالص بنا ہے جو اردو میں کثیر الاستعمال ہے۔ عربی میں ''ھـذا ثـوبٌ خـالصٌ'' کے معنی ہیں ''یہ صاف رنگ کا کپڑا ہے''، یعنی اس میں کسی دوسرے رنگ کی آمیزش نہیں ہے۔ دین کے معنی لغت میں متعدد ہیں۔ ایک معنی اطاعت کے بھی ہیں۔ اوپر کی آیت میں یہ اطاعت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

''اخلاص اور دین'' کی اس لغوی وضاحت کے مطابق مذکورہ بالا آیات میں اخلاص دین کا مفہوم یہ ہوا کہ خدا کی اطاعت کے ساتھ کوئی دوسری اطاعت یا اطاعتیں جمع نہ ہوں۔ خدا کی خالص اطاعت و بندگی کو جن چیزوں نے ہمیشہ سے داغ دار کیا ہے ان میں نفس اور مخلوق کی اطاعت نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ اول الذکر اطاعت کے متعلق فرمایا گیا ہے:

أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ هَوَاهُ. (سورۂ جاثیہ:۲۳)

''کیاتم نے دیکھا اس آدمی کو جس نے اپنی خواہش کو معبود بنالیا ہے۔''

موخر الذکر اطاعت میں مرئی اور غیر مرئی دونوں مخلوقات شریک رہی ہیں۔ غیر مرئی مخلوق میں فرشتے اور مرئی مخلوق میں وفات یافتہ بزرگان دین قابل ذکر ہیں۔ ہم نے اوپر سورۂ زمر کی جو آیت نقل کی ہے، جس میں خدا کی خالص اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، اس سے ٹھیک متصل یہ آیت ہے:

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ أَوْلِيَآءَ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا إِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى إِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كَاذِبٌ كَفَّارٌ. (سورۂ زمر:۳)

''اور جن لوگوں نے اس کے سوا دوسرے کارساز (اولیاء) بنا رکھے ہیں، کہتے ہیں کہ ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ہم کو خدا سے قریب کر دیں۔ اللہ ان کے درمیان اس بات کا فیصلہ کرے گا جس میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔ اللہ ان لوگوں کو راہ نہیں دکھاتا جو جھوٹے اور ناشکرے ہیں۔''

اس آیت میں بہت واضح طور پر وفات یافتہ صلحا اور انبیا کی کارسازی کی تردید کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ جو لوگ یہ خیال رکھتے ہیں وہ جھوٹے ہیں اور ناشکرے بھی۔ نفس پرستی اور غیر خدا کی مطلق کارسازی کے عقیدہ کے علاوہ درج ذیل امور بھی اخلاص عبادت کے منافی ہیں:

۱۔ خدا کے سوا کسی دوسرے کو، خواہ وہ نبی اور ولی ہی کیوں نہ ہو، سجدہ نہ کیا جائے اس لیے کہ سجدہ عبادت (نماز) کا ایک اہم رکن ہے اور وہ اللہ کے لیے مخصوص ہے۔ فرمایا گیا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ. (سورۂ حج:۷۷)

''اے ایمان والو! رکوع اور سجدہ کرو اور اپنے رب کی عبادت کرو۔''

معلوم ہوا کہ رکوع اور سجدہ عبادت میں داخل ہیں اس لیے یہ دونوں عمل کسی بھی شکل میں مخلوق کے لیے جائز نہیں، خواہ تعظیم کی غرض سے ہو اور خواہ اطاعت و بندگی کے اظہار کے لیے[18]۔ یہاں کسی کے ذہن میں یہ بات آ سکتی ہے کہ قرآن میں برادران یوسف کی سجدہ گزاری کا ذکر آیا ہے۔ اس سجدہ کا مطلب زمین پر گر جانا نہیں، بلکہ سر کو ذرا آگے کی طرف خم کرنا ہے۔ اس کو انگریزی میں Bow down کہتے ہیں[19]۔ اس سے مقصود اعتراف عزّ و کمال ہے۔

۱۸؎ فتاویٰ عالم گیری کے الفاظ ہیں: 'لا يكفر ولكن باثم لارتكابه الكبيرة' (ص۳۶۹) ''غیر اللہ کو سجدۂ تعظیمی کرنے والوں کی تکفیر تو نہیں کی جائے گی لیکن گنہ گار ٹھہرایا جائے گا اس لیے کہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا ہے۔''

قرآن مجید میں متعدد مقامات پر آسمان و زمین نیز درخت اور پہاڑ کی سجدہ گزاری کا بیان ہے۔ظاہر ہے کہ یہ چیزیں معروف معنی میں سجدہ نہیں کرسکتی ہیں اس لیے لازماً ان کے سجدے کا مطلب اللہ کے طبعی قوانین کی تعمیل ہے۔پس کسی مخلوق کو حقیقی معنی میں سجدہ کرنا ظاہر کرتا ہے کہ سجدہ گزار اس کا مطیع و عابد ہے اور یہ عمل اخلاص عبادت کے منافی ہوگا۔

۲۔کسی مخلوق کو مافوق الطبعی طور پر حاجت روا[20] اور مشکل کشا سمجھ کر نہ پکارا جائے کہ یہ عمل اخلاص عبادت کے منافی ہے۔صاف لفظوں میں کہا گیا ہے:

وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ. (سورۂ یونس۶:۱۰۶)

''اللہ کے سوا کسی کو نہ پکارو جو نہ تمھیں نفع پہنچائیں اور نہ نقصان۔اگر تم نے ایسا کیا (یعنی حاجتوں اور مصیبتوں میں غیر خدا کو مدد کے لیے پکارا) تو تمھارا شمار ظالموں (مشرکوں) میں ہوگا۔''

ہر مذہب کے درویشوں اور ولیوں کے بارے میں اس کے غالی پیرووں کا یہ خیال رہا ہے اور آج بھی ہے کہ وہ خدا کی طرف سے تصرف کا اختیار رکھتے ہیں اور اپنے ماننے والوں کو نفع و نقصان پہنچا سکتے ہیں۔اسی باطل خیال کے تحت وہ ان کے مقابر پر جا کر ان سے مدد مانگتے ہیں۔قرآن مجید میں اس اختیار و تصرف کی شدت کے ساتھ تردید کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ کوئی مخلوق کسی نوع کے مافوق الفطری اختیار سے بہرہ ور نہیں ہے۔اس مضمون کی چند آیات ملاحظہ ہوں:

وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ . اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ. (سورۂ فاطر۳۵:۱۳-۱۴)

''اس کے سوا جن ہستیوں کو تم پکارتے ہو وہ کھجور کی گٹھلی کے بھی مالک نہیں ہیں۔اگر تم انھیں پکارو تو وہ (بذات خود) تمھاری پکار کو سن نہیں سکتے، اور اگر (کسی ربّانی ذریعہ سے) سن بھی لیں تو تمھاری حاجت روائی نہیں کر سکتے، اور روز آخرت وہ تمھارے شرک کا انکار کر دیں گے، ایک باخبر (یعنی اللہ) کے سوا کوئی دوسرا تمھیں اس حقیقت کی خبر نہ دے گا۔''

۱۹؎ توریت کے انگریزی ترجمہ میں اس مقام پر Bow down ہی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

۲۰؎ قرآن مجید میں ہے: 'فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ' (العنکبوت ۱۷) ''پس اسی سے رزق چاہو، اور اسی کی بندگی کرو اور اس کا شکر بجالاؤ۔''

أَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا أَنْ يَتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْ أَوْلِيَآءَ إِنَّا أَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِيْنَ نُزُلًا. (سورۂ کہف۱۰۲:۱۸)

''پس کیا منکرین حق نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ وہ مجھ کو چھوڑ کر میرے بندوں کو اپنا ولی اور کارساز بنا لیں (اور میں ان کا محاسبہ نہ کروں گا) ہم نے جہنم کو ایسے منکروں کے استقبال کے لیے تیار کر رکھا ہے۔''

قُلْ أَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖٓ أَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِأَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا. (سورۂ رعد۱۳:۱۶)

''کہو، کیا تم لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر ان کو اپنا ولی اور کارساز بنا لیا ہے جو خود اپنے نفع و نقصان کا بھی اختیار نہیں رکھتے۔''

مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ أَحَدًا. (سورۂ کہف۱۸:۲۶)

''اس کے سوا ان کا کوئی کارساز نہیں ہے اور وہ اپنے اختیار میں کسی کو ساجھی نہیں بناتا۔''

بہت سے نادان کہتے ہیں، اور عرب کے مشرکین کا بھی خیال تھا، کہ وہ حاجات و بلایا میں غیر خدا کو محض وسیلہ سمجھ کر پکارتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں چونکہ وہ خدا کے مقرب ہیں اس لیے وہ اللہ سے کہہ کر ان کی مرادیں پوری کر دیتے ہیں یا ان کے کہنے سے اللہ ان کی حاجتیں پوری کرتا ہے۔ گویا وہ خدا کے ہاں ان کے سفارشی ہیں۔ قرآن مجید نے اس خیال کو باطل قرار دیا ہے۔ فرمایا گیا ہے:

أَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ قُلْ أَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ. قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا لَّهٗ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ. (سورۂ زمر۳۹:۴۳۔۴۴)

''کیا انھوں نے اللہ کے سوا دوسروں کو سفارشی بنا رکھا ہے! کہو، اگرچہ نہ وہ کچھ اختیار رکھتے ہوں اور نہ کچھ سمجھتے ہوں۔ کہہ دو کہ سفارش تمام تر اللہ ہی کے اختیار میں ہے، آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے۔ پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔''

دوسری جگہ فرمایا ہے:

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ قُلْ أَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ. (سورۂ یونس۱۰:۱۸)

''اور وہ اللہ کے سوا ایسوں کی پرستش کرتے ہیں جو نہ ان کو نفع پہنچا سکیں اور نہ نقصان، اور وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں، کہہ دو، کیا تم اللہ کو ایسی بات کی خبر دیتے ہو جس کا اس کو علم نہیں، نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں۔ وہ پاک اور بلند ہے

ان چیزوں سے جن کو وہ اس کا شریک ٹھیراتے ہیں۔''

نادان لوگ جن اولیاء اور بزرگان دین کے وسیلے پر اعتماد کرتے ہیں ان کا حال قرآن مجید نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا. أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ إِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا.

(سورۂ بنی اسرائیل ۱۷: ۵۶، ۵۷)

''کہو کہ ان کو پکار دیکھو، جن کو تم نے اس کے سوا معبود خیال کر رکھا ہے، وہ نہ تم سے کسی مصیبت کو دفع کر سکیں گے، نہ اس کو ٹال سکیں گے۔ یہ لوگ جن کو پکارتے ہیں وہ تو خود ہی اپنے رب تک رسائی حاصل کرنے میں لگے ہوئے ہیں کہ ان میں سے کون سب سے زیادہ مقرب بنتا ہے۔ وہ اپنے رب کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ بے شک تمھارے رب کا عذاب ہے ہی ڈرنے کے قابل۔''

۳۔ اخلاص عبادت میں یہ بات بھی داخل ہے کہ خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں میں کسی مخلوق کو شریک نہ کیا جائے۔ یہ گمان رکھنا کسی مومن کے لیے جائز نہیں کہ اس کو جو نعمتیں حاصل ہیں، خواہ اولاد ہو، مال و منال ہو یا عہدہ و منزلت، وہ خدا کے سوا کسی اور نے دی ہیں، براہ راست یا بالواسطہ، فرمایا گیا ہے:

وَاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ. (سورۂ نحل ۱۶: ۱۱۴)

''اور اللہ کی نعمت کا شکر بجا لاؤ اگر تم فی الواقع اسی کی عبادت کرتے ہو۔''

قرآن مجید میں ایک دوسری جگہ تمثیل کے پیرایہ میں اس حقیقت کو ان لفظوں میں ذہن نشین کرایا گیا ہے:

فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ فَلَمَّا أَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ اٰتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ. فَلَمَّا اٰتٰهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَا اٰتٰهُمَا فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ. أَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْئًا

''پھر جب مرد نے عورت کو ڈھانک لیا تو اسے ایک خفیف سا حمل رہ گیا جسے وہ لیے چلتی پھرتی رہی۔ پھر جب وہ بوجھل ہو گئی تو دونوں (مرد اور عورت) نے اللہ سے، جو ان کا رب ہے، دعا کی کہ خدایا اگر تو نے ہمیں ایک تندرست اور بے عیب بچہ عطا کیا تو ہم تیرے شکر گزار رہوں گے۔ مگر جب اللہ نے ان کو ایک

وَهُمْ يُخْلَقُوْنَ. وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَلَا أَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ. وَإِنْ تَدْعُوْهُمْ إِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ أَدَعَوْتُمُوْهُمْ أَمْ أَنْتُمْ صَامِتُوْنَ. إِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ أَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ. (سورۂ اعراف ۷:۱۸۹-۱۹۴)

صحیح وسالم بچہ دے دیا تو اس کی بخشی ہوئی اس نعمت میں دوسروں کو اس کا شریک ٹھہرانے لگے۔ اللہ کی ذات بہت بلند و برتر ہے ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ کیا یہ لوگ خدا کے ساتھ ان کو شریک ٹھہراتے ہیں جو کسی چیز کے بھی خالق نہیں بلکہ مخلوق ہیں۔ وہ نہ تو ان کی مدد پر قادر ہیں اور نہ ہی اپنی ذات کو مدد پہنچانے کی قدرت رکھتے ہیں۔ اگر تم ان کو رہ نمائی کے لیے پکارو تو وہ تمھارے ساتھ نہ چلیں۔ خواہ تم انھیں پکارو یا چپ رہو (باعتبار نتیجہ) یکساں ہے۔ تم اللہ کے سوا جن ہستیوں کو پکارتے ہو وہ تو تمھارے ہی جیسے بندے ہیں۔ پس ان کو پکار دیکھو، وہ تمھیں جواب دیں اگر تم سچے ہو۔''

۴۔ غیر خدا پر اعتماد کہ وہ علی الاطلاق نفع وضرر پہنچانے کا اختیار رکھتے ہیں، اخلاص عبادت کے خلاف ہے۔ اس کے برعکس اس بات پر اعتماد رکھا جائے کہ ہر قسم کے نفع و نقصان کا سر رشتہ صرف خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اگر وہ اپنے کسی بندے کو کوئی فائدہ پہنچانا چاہے تو سارا جہاں مل کر بھی اس کو روک نہیں سکتا اور اگر کسی کے حق میں اس کے اعمال بد کی پاداش میں نقصان کا فیصلہ کر دے تو اس سے کوئی اس کو بچا نہیں سکتا ہے۔ (سورۂ یونس ۱۷) عبادت اور توکل کا یہ ارتباط آیۂ ذیل سے بالکل واضح ہے:

فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ. (سورۂ ہود ۱۱:۱۲۳) ''اس کی بندگی کرو اور اسی پر بھروسہ کرو۔''

عبادت کا وسیع مفہوم

عبادت کا لفظ جب اصطلاحاً استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے عام طور پر بعض معروف اعمال عبادت، مثلاً پرستش، دعا اور قربانی وغیرہ مراد لیے جاتے ہیں، اخلاق اور معاملات اس میں شامل نہیں سمجھے جاتے ہیں۔ اسلام نے عبادت کے اس محدود مفہوم کو ختم کیا اور بتایا کہ بندوں کے حقوق کی ادائیگی بھی عبادت میں داخل ہے۔ جس نے خدا کا حق ادا کیا، لیکن بندوں کے حقوق، جو خدا نے اس پر عائد کیے ہیں، ادا نہ کیے تو وہ خدا کی نظر میں عابد شمار نہ ہوگا۔ قرآن مجید

میں ایک سے زیادہ مقامات پر عبادت کے اس پہلو کو واضح کیا گیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

وَاعۡبُدُوا اللّٰہَ وَلَا تُشۡرِکُوۡا بِہٖ شَیۡئًا وَّبِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا وَّبِذِی الۡقُرۡبٰی وَالۡیَتٰمٰی وَالۡمَسٰکِیۡنِ وَالۡجَارِ ذِی الۡقُرۡبٰی وَالۡجَارِ الۡجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالۡجَنۡۢبِ وَابۡنِ السَّبِیۡلِ ۙ وَمَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنۡ کَانَ مُخۡتَالًا فَخُوۡرَا. (سورۂ نساء:۳۶)

''اور اللہ ہی کی بندگی کرو اور کسی چیز کو بھی اس کا شریک نہ ٹھہراؤ۔ اور والدین، رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، قرابت دار پڑوسی، اجنبی پڑوسی (یعنی جس سے کوئی آشنائی نہ ہو) ہم نشین مسافر اور اپنے لونڈی غلاموں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ اور (مال و جاہ پا کر) اترانے والوں اور گھمنڈ کرنے والوں کو اللہ پسند نہیں کرتا۔''

دوسری جگہ فرمایا ہے:

قَالَ یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰہٍ غَیۡرُہٗ ؕ وَلَا تَنۡقُصُوا الۡمِکۡیَالَ وَالۡمِیۡزَانَ اِنِّیۡۤ اَرٰىکُمۡ بِخَیۡرٍ وَّاِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ عَذَابَ یَوۡمٍ مُّحِیۡطٍ. وَیٰقَوۡمِ اَوۡفُوا الۡمِکۡیَالَ وَالۡمِیۡزَانَ بِالۡقِسۡطِ وَلَا تَبۡخَسُوا النَّاسَ اَشۡیَآءَہُمۡ وَلَا تَعۡثَوۡا فِی الۡاَرۡضِ مُفۡسِدِیۡنَ. (سورۂ ہود:۸۴-۸۵)

''اے میری قوم کے لوگو! اللہ ہی کی بندگی کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں، اور ناپ تول میں کمی نہ کرو۔ (اس وقت) میں تمھیں اچھی حالت (یعنی فارغ البالی) میں دیکھ رہا ہوں (لیکن آگے) میں تم پر ایک گھیرنے والے دن کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہوں۔ اور اے میری قوم کے لوگو! ناپ اور تول کو انصاف کے ساتھ پورا کرو۔ اور لوگوں کی چیزوں میں ان کی حق تلفی نہ کرو اور زمین میں فساد پھیلانے والے بن کر نہ پھرو۔''

ماضی میں دیگر اقوام کی طرح قوم شعیب کا تصور عبادت بھی ناقص تھا۔ چنانچہ جب شعیب علیہ السلام نے انھیں مالی معاملات میں انصاف سے کام لینے کی تلقین کی، جیسا کہ اوپر کی آیت میں بیان ہوا ہے، تو انھوں نے کہا:

اَصَلٰوتُکَ تَاۡمُرُکَ اَنۡ نَّتۡرُکَ مَا یَعۡبُدُ اٰبَآؤُنَاۤ اَوۡ اَنۡ نَّفۡعَلَ فِیۡۤ اَمۡوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ؕ اِنَّکَ لَاَنۡتَ الۡحَلِیۡمُ الرَّشِیۡدُ. (سورۂ ہود:۸۷)

''کیا تمھاری نماز تمھیں یہ سکھاتی ہے کہ ہم ان چیزوں سے دست بردار ہو جائیں جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے آئے ہیں یا یہ کہ ہم اپنے مال میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف نہ کریں، (کیا خوب) بس

تھی تو ایک دانش منداور راست رو ہو۔‘‘

فی الحقیقت اسلام میں انسان کا ہر عمل عبادت اور باعث اجر ہے، خواہ وہ عمل بادی النظر میں بالکل حقیر ہو، بلکہ سراسر دنیا کا کام معلوم ہوتا ہو، بشرطیکہ اس عمل سے خدا کی رضا اور اس کا تقرب مطلوب ہو۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت سعد نے خدمت اقدس میں آکر عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول، میں اپنی کل دولت راہ خدا میں خرچ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا، سعد تم جو کچھ راہ خدا میں صرف اس کی خوش نودی کی طلب میں خرچ کرو گے اس کا ثواب تم کو ضرور ملے گا یہاں تک کہ جو لقمہ تم اپنی بیوی کے منہ میں اس غرض سے ڈالو گے اس کا بھی تم کو ثواب ملے گا۔[21]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی ملاحظہ ہو:

ما اطعمت نفسك فهو لك صدقة، ما اطعمت ولدك فهو لك صدقة، ما اطعمت زوجك فهو لك صدقة، ما اطعمت خادمك فهو لك صدقة. (مسند احمد)	’’تم نے خود اپنے آپ کو جو کھلایا وہ تمھاری طرف سے صدقہ ہے، جو اپنی اولاد کو کھلایا وہ بھی تمھاری طرف سے صدقہ ہے، جو اپنی بیوی کو کھلایا وہ تمھاری طرف سے صدقہ ہے اور اپنے نوکر کو جو کھلایا وہ بھی تمھاری طرف سے صدقہ ہے۔‘‘

بہت سے قارئین یہ جان کر حیران ہوں گے کہ اسلام میں میاں بیوی کے جنسی تعلقات بھی عبادت میں داخل ہیں۔ ایک بار آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ مباشرت بھی صدقہ ہے۔ انھوں نے تعجب سے کہا، کیا شہوت کے پورا کرنے میں بھی اجر ہے؟ فرمایا، تمھارا کیا خیال ہے، اگر وہ یہ کام حرام طریقے سے کرتا تو کیا اس پر گناہ نہ ہوتا؟ صحابہ نے کہا، ضرور یہ فعل گناہ ہوگا۔ آپ نے فرمایا، تو جب وہ یہی کام حلال طریقے سے کرے گا تو اس کو یقیناً ثواب ملے گا۔ ’كذالك اذا وضعها فى الحلال كان له اجر‘۔[22]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا:

ما من مسلم يغرس غرسا او يزرع زرعا فيأكل منه طير أو انسان أو بهيمة الا كان له صدقة. (متفق علیہ)	’’جس مسلمان نے بھی درخت لگایا یا کھیتی کی پھر اس درخت یا کھیتی سے چڑیا یا انسان یا جانور کھائے تو یہ ضرور اس کی طرف سے صدقہ ہوگا۔‘‘

انسانی معاشرے میں مزاج اور مفادات کے مختلف ہونے کی وجہ سے بسا اوقات آپس کے تعلقات متاثر ہوتے

21۔ ادب المفرد، امام بخاری، باب: يوجر فى كل شئى۔

22۔ رواہ مسلم والترمذی، مزید دیکھیں، مسند احمد۔

ہیں اور دلوں میں بغض ونفرت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان بگڑے ہوئے تعلقات کو درست کرنا بھی عبادت ہے۔ ایک بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ میں تم کو نفل روزہ و نماز اور صدقہ سے بھی بڑھ کر درجہ کی چیز نہ بتاؤں۔ صحابہ نے عرض کیا، یا رسول اللہ ضرور ارشاد فرمائیں۔ آپ نے کہا، وہ ہے آپس کے تعلقات کا درست کرنا، یعنی اصلاح ذات البین[۲۳]۔

اتنا ہی نہیں، ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دینا، گونگے کو سنا دینا، اور اندھے کو راہ دکھا دینا بھی اسلام میں نیکی اور صدقہ ہے۔ حضرت ابو ہریرہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آدمی کی معمولی باتیں بھی اس کے لیے صدقہ ہیں۔ مثلاً انصاف کی بات کہنا، آدمی کو اس کے جانور پر سوار کرا دینا یا اس کے سامان کو اس پر لا د دینا، بھلی بات کہنا، نماز کے لیے پیدل چل کر جانا اور راستے سے تکلیف دہ چیز کا ہٹا دینا وغیرہ[۲۴]۔

خدمت خلق

اسلام کے تصور عبادت میں، جیسا کہ ابھی اوپر بیان ہوا، خدمت خلق کا شمار عبادت میں ہے اور اس کا درجہ بہت بلند ہے۔ ایک حدیث میں کل مخلوق کو خدا کا کنبہ کہا گیا ہے اور وہی شخص اس کی نگاہ میں زیادہ محبوب ہے جو اس کے کنبہ کے لیے زیادہ خیر خواہ اور نفع بخش ہو۔ حدیث کے الفاظ ہیں: 'الخلق کلهم عيال اللّٰه واحبهم اليه انفعهم لعياله'[۲۵]۔

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ مسکین اور بیوہ کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والے کا مرتبہ خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے، روزہ دار اور رات میں نماز پڑھنے والے کے برابر ہے 'الساعی علی الارملة والمسكين كالمجاهد فی سبيل اللّٰه و كالذی يصوم النهار ويقوم الليل'[۲۶]۔

ایک بار کا واقعہ ہے کہ رسول اللہ کی خدمت میں کچھ لوگ انتہائی پریشاں حالی میں صرف کمبل اوڑھے ہوئے حاضر ہوئے۔ آپ کی نظر جیسے ہی ان کے خستہ حال چہرے پر پڑی اداس ہو گئے۔ گھر میں تشریف لے گئے، کچھ دینے کو نہ ملا تو مایوسی کے عالم میں باہر آ گئے۔ بلال سے کہا کہ تمام مسلمانوں کو جمع کرو۔ وہ جمع ہوئے اور سب نے مل کر کافی

۲۳؎ سنن ابوداؤد، کتاب الادب، باب: اصلاح ذات البین۔

۲۴؎ رواہ البخاری ومسلم۔

۲۵؎ رواہ ابوالعلیٰ۔

۲۶؎ بخاری، کتاب الادب۔

سرمایہ اکٹھا کیا اور رسول اللہ کے حوالہ کر دیا۔ یہ دیکھ کر آپ نہایت خوش ہوئے۔ واقعے کے راوی حضرت جابر بن عبداللہ کے الفاظ ہیں: 'فرأیت وجه رسول اللّٰه کانه مذهبة'' 'پھر میں نے دیکھا کہ رسول اللہ کا چہرہ سونے کی طرح دمک رہا ہے۔'[۲۷]

اس سلسلے میں ایک حدیث قدسی بھی قابل ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ روز آخرت فرمائے گا:

''اے ابن آدم! میں بیمار ہو گیا تھا مگر تو نے میری عیادت نہ کی۔ بندہ عرض کرے گا: اے رب میں بھلا تیری عیادت کیونکر کرتا، تو تو پروردگار عالم ہے۔ خدا فرمائے گا: کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہو گیا تھا اور تو نے اس کی عیادت نہیں کی، اگر تو اس کی خبر گیری کو جاتا تو اس کو میرے پاس پاتا یا مجھے اس کے پاس پاتا۔ اے ابن آدم! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا مگر تو نے نہیں کھلایا۔ بندہ عرض کرے گا: اے رب میں تجھ کو کیونکر کھلاتا تو تو خود سارے جہاں کا پروردگار ہے۔ خدا فرمائے گا: کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرے فلاں (بھوکے) بندے نے تجھ سے کھانا مانگا مگر تو نے نہیں کھلایا، اگر تو اس کو کھلاتا تو اسے میرے پاس پاتا۔ اے ابن آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا تھا مگر تو نے نہیں پلایا۔ بندہ عرض کرے گا: اے رب میں تجھے کیونکر پانی پلاتا کہ تو رب العٰلمین ہے۔ خدا فرمائے گا: میرے فلاں (پیاسے) بندے نے تجھ سے پانی مانگا مگر تو نے نہیں پلایا۔ اگر تو اس کو پانی پلاتا تو اسے میرے پاس پاتا۔'' (مسلم، رواہ ابوہریرہ، مزید دیکھیں، ادب المفرد (امام بخاری) باب: عیادۃ المرضیٰ)

انسان تو بڑی چیز ہے، اسلام میں جانوروں کے ساتھ حسن سلوک کو بھی نیکی کا کام بتایا گیا ہے۔ ایک مجلس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو ایک آدمی کا واقعہ سنایا کہ اس نے ایک کتے کو دیکھا کہ وہ پیاس کی شدت سے زبان نکالے ہوئے مٹی چاٹ رہا ہے (یلهث یا کل الثری من شدة العطش) چنانچہ یہ دیکھ کر اس کے دل میں رحم آیا اور اس نے پسند نہ کیا کہ وہ اس کتے کو، جب کہ وہ شدید پیاس میں مبتلا ہے، یونہی چھوڑ دے۔ چنانچہ وہ اس کو لے کر ایک کنویں کے پاس پہنچا اور اپنا موزہ اتار کر اس میں پانی بھرا اور اس کتے کو پلایا۔ اللہ نے اس کے اس عمل کو پسند کیا اور اس کو بخش دیا۔ جب صحابہ نے یہ قصہ سنا تو تعجب سے کہا، اے اللہ کے رسول، کیا جانوروں کے ساتھ حسن سلوک میں بھی اجر ہے 'ائن لنا فی البهائم لأجرا یا رسول اللّٰه' فرمایا، ہر ذی حیات کے ساتھ حسن سلوک میں اجر ہے۔[۲۸]

اسلام نے مخلوق خدا کے ساتھ حسن سلوک کو محض نیکی قرار نہیں دیا، بلکہ اس کو اسلامی عبادات میں ایک اہم عبادت

۲۷؎ مسلم۔

۲۸؎ رواہ البخاری۔

کا درجہ دیا۔ اسلام میں نماز کے بعد جو دوسری بڑی عبادت ہے وہ زکوٰۃ ہے، جو غربا و مساکین کی خبر گیری کا دوسرا نام ہے۔ قرآن مجید میں اکثر مقامات پر نماز کا ذکر زکوٰۃ کے ساتھ آیا ہے 'اقیموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ' اس التزام سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ نماز اور زکوٰۃ لازم وملزوم ہیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اسلام میں ایک بندۂ مومن کا ہر وہ کام، خواہ بڑا ہو یا چھوٹا، خواہ آخرت سے تعلق رکھتا ہو یا دنیا سے، عبادت ہے جو خدا کی رضا اور خوش نودی کے لیے کیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کی ادائیگی عبادت میں داخل ہے۔

راہبانہ تصور عبادت کی نفی

تاریخ انسانی کے ہر دور میں ہر مذہب کے غالی اور متقشف لوگوں کا یہ خیال رہا ہے کہ آدمی خدا کی عبادت میں جس قدر ریاضات شاقہ اٹھاتا ہے اسی قدر اس کو خدا کی رضامندی اور اس کا قرب واتصال حاصل ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ ان کا یہ بھی خیال رہا ہے کہ خدا کی خالص اور سچی عبادت کے لیے ناگزیر ہے کہ آدمی انسانی معاشرہ اور اس کے علائق سے قطع تعلق کر کے جنگل یا پہاڑ کے کسی گمنام گوشے میں معتکف ہو جائے، اور اگر کسی سبب سے یہ ممکن نہ ہو تو کم از کم انسانی آبادی سے دور کوئی خانۂ عزلت تلاش کر لے، اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو آبادی کے اندر ہی کوئی خاموش گوشۂ عافیت ڈھونڈ لے اور وہاں ہنگامہ ہائے دنیا سے بے خبر ہو کر خدا کی عبادت و ریاضت میں اپنا وقت گزارے۔ گویا ان کے نزدیک خدا کے حق کی ادائیگی کے لیے حقوق العباد سے منہ موڑنا اور امکانی حد تک خود اپنے نفس و جسم کے حقوق کو پامال کرنا ناگزیر ہے۔ اس راہبانہ تصور عبادت کی بہت سی مثالیں انسان کی قدیم مذہبی تاریخ میں موجود ہیں، اس سے پہلے ہم عیسائی رہبان اور ہندو جوگیوں کے احوال بیان کر چکے ہیں جن سے راہبانہ تصور عبادت کا مفہوم اور اس کے اطراف و جوانب پوری طرح واضح ہو گئے ہیں۔

جہاں تک اسلامی تاریخ کا تعلق ہے اس کے تقریباً ہر عہد میں مسلمانوں کے اندر ایسے مذہبی لوگ موجود رہے ہیں جو راہبانہ تصور عبادت سے ایک حد تک مانوس تھے، اگرچہ وہ عیسائی راہبوں کی طرح مکمل طور پر تجرد کے قائل نہ تھے اور نہ ہی تربیت نفس کے معاملے میں نفس کشی اور تعذیب جسم کی حد تک پہنچے ہوئے تھے[۲۹]۔ پھر بھی ان کا عام طرز زندگی راہبانہ تھا، اور وہ عام طور پر مخلوق خدا سے الگ تھلگ ہو کر زندگی گزارتے تھے اور ازدواجی تعلق بھی برائے نام ہی رکھتے تھے۔ یہ غالی صوفیوں کا طبقہ تھا۔

۲۹؎ شاذ میں اس کی مثالیں بھی موجود ہیں۔

آج بھی مسلمانوں میں ایک ایسا مذہبی طبقہ موجود ہے جس کے تصور عبادت میں راہبانہ تصور عبادت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ اس طبقہ سے تعلق رکھنے والے افراد علانیہ ترک دنیا کی تعلیم تو نہیں دیتے لیکن ان کے نزدیک روحانی ترقی اور آخرت میں کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ عابد و زاہد مسلمان اسباب دنیا کی نفی کرے یا ان سے برائے نام تعلق رکھے اور اپنے اوقات کا بیشتر حصہ کسی گوشۂ مسجد یا خانۂ خلوت میں بیٹھ کر ذکر الٰہی، مراقبہ اور مجاہدہ میں گزارے۔ ان کے نزدیک یہی معراج عبادت ہے۔ یہ خیال بھی راہبانہ تصور عبادت ہی کی ایک قسم ہے۔

راہبانہ تصور عبادت کو صحیح تسلیم کر لینے کے معنی یہ ہیں کہ یہ کارخانۂ خلق و ایجاد ایک کار عبث ہے اور اس میں انسانی وجود کی تخلیق بھی بے مقصد ہے۔ اور یہ تصور حقیقت واقعہ کے خلاف ہوگا۔ اسلام نے بتایا کہ یہ کائنات کوئی بازیچۂ اطفال نہیں 'وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَاعِبِيْنَ' (سورۂ انبیاء ۱۶) بلکہ اس کی تخلیق کے پیچھے ایک عظیم مقصد ہے اور وہ مقصد حق و باطل کی آویزش اور اس کے نتیجے میں حق کا غلبہ اور باطل کا استیصال ہے 'بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ' (سورۂ انبیاء ۱۸)۔

اس کے علاوہ اس عالم آب و گل میں انسانی وجود ایک مرکزی مقام رکھتا ہے۔ انسان کی عظمت و فضیلت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ خدا نے اس کو زمین میں خلیفہ بنایا 'هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ الخ' (سورۂ فاطر ۳۹) اور اس جہان رنگ و بو کی تمام چھوٹی اور بڑی اشیاء کو اس کے دست تصرف میں دے دیا 'وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ' (سورۂ جاثیہ:۱۳) اس مقام و مرتبے کے حامل انسان کا مقصد تخلیق یہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ وہ اس دنیا سے اپنا ذہنی و عملی رشتہ منقطع کر کے کسی کنج عزلت میں جا بیٹھے اور وہاں عبادت و ریاضت میں اپنی پوری زندگی گزار دے۔

جب معلوم ہو گیا کہ انسان اس زمین میں خلیفہ بنایا گیا ہے تو اس کا مقصد تخلیق خود بخود واضح اور متعین ہو جاتا ہے۔ اور وہ مقصد یہ ہے کہ وہ خدا کی زمین میں اپنی مرضی اور خوشی سے اس کے حکم و ہدایت کے مطابق زندگی گزارے، انفرادی بھی اور اجتماعی بھی۔ یہی وہ عبادت ہے جس کے لیے انسان کی تخلیق عمل میں آئی ہے۔ فرمایا گیا ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ. (سورۂ ذاریات:۵۶)

''میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔''

حقیقت یہ ہے کہ اسلام راہبانہ تصور عبادت کا مخالف ہی نہیں بلکہ اس کے وجود تک کا منکر ہے: 'لا رھبانیة فی

الاسلام[30]'، اگر کسی شخص کو لفظ رہبانیت سے کوئی خاص انس وشیفتگی ہو تو وہ جان لے کہ اسلام کے لغت میں اس کا مفہوم ترک دنیا نہیں بلکہ جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: 'رھبانیة ھذہ الامة الجھاد فی الاسلام[31]'، اس امت کی رہبانیت اللہ کی راہ میں جہاد کرنا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے سختی کے ساتھ رہبانیت کے جملہ اعمال واشکال، مثلاً ترک دنیا یعنی قطع علائق، نفس کشی یعنی ترک لذائذ، اور عبادت (پرستش) میں ریاضات شاقہ وغیرہ کی نفی کی ہے، جیسا کہ اگلی سطروں سے بالکل واضح ہو جائے گا۔

ترک دنیا

قرآن کے بیان کے مطابق، جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، انسان کا مقصد تخلیق خدا کی عبادت ہے، یعنی اس کے احکام کے مطابق اس زمین پر زندگی گزارنا۔ اس تصور عبادت کے مطابق ترک دنیا ممکن نہیں، بلکہ اس میں ضروری حد تک شمولیت ناگزیر ہے۔ فرمایا گیا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ. فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ.

''اے ایمان والو! جب جمعہ کے دن کی نماز کے لیے پکارا جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔ یہ تمھارے حق میں زیادہ بہتر ہے اگر تم جانو۔ پھر جب نماز ختم ہو جائے تو اللہ کے فضل کی طلب میں زمین میں پھیل جاؤ۔ اور اللہ کو بکثرت یاد کرو تاکہ تمھیں کامیابی حاصل ہو۔''

(سورۂ جمعہ ۶۲: ۹-۱۰)

یہ آیت بتاتی ہے کہ ایک بندۂ مومن اس دنیا میں کس طرح زندگی گزارے۔ وہ خدا کی عبادت بھی کرے اور فضل خدا (روزی) کی تلاش سے بھی غافل نہ ہو، بلکہ اس میں سرگرمی دکھائے۔ البتہ اس بات کا دھیان رکھے کہ تلاش رزق میں اس سے ایسا کوئی فعل سرزد نہ ہو جو خدا کے حکم وہدایت کے خلاف ہو۔ اس آیت میں صرف یہی نہیں کہا گیا ہے کہ وہ روزی کمانے میں جدوجہد کرے بلکہ اس عمل کو فضل خدا کی طلب سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ لطیف پیرایۂ بیان خود

[30] مسند ابن حنبل، ج۵، ص۲۶۶۔

[31] مسند ابن حنبل، ج۵، ص۲۶۶۔

صراحت کرتا ہے کہ روزی کمانا خدا کی نظر میں ایک پسندیدہ فعل ہے اور وہ اپنے بندوں سے اس بات کا خواہاں ہے کہ وہ روزی کمانے کے لیے زمین میں تگ ودو کریں 'فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ'، اس کو محض دنیا کا کام یا خدا کی عبادت میں کوئی رکاوٹ سمجھ کر اس سے کنارہ کشی اختیار نہ کریں۔ قرآن مجید میں ایک جگہ کسب معاش کا ذکر جہاد فی سبیل اللہ کے ساتھ آیا ہے جو اس کی فضیلت کی دلیل ہے۔ فرمایا گیا ہے:

عَلِمَ اَنْ سَیَکُوْنُ مِنْکُمْ مَّرْضٰی وَاٰخَرُوْنَ یَضْرِبُوْنَ فِی الْاَرْضِ یَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ وَاٰخَرُوْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَاقْرَءُ وْا مَا تَیَسَّرَ مِنْہُ. (سورۂ مزمل: ۲۰)

''اس کے علم میں ہے کہ تم میں مریض ہوں گے اور ایسے لوگ بھی جو اللہ کے فضل کی تلاش میں سفر کریں گے اور کچھ دوسرے لوگ بھی ہوں گے جو اللہ کی راہ میں جہاد کا ارادہ رکھتے ہوں گے تو جتنا آسانی کے ساتھ ہو سکے اتنا قرآن پڑھو۔''

اس آیت کی بہترین تفسیر حضرت عمر فاروق کا یہ قول ہے کہ ''خدا کی راہ میں لڑتے ہوئے جان دینے کی خواہش کے بعد جس دوسری چیز کی میں تمنا رکھتا ہوں وہ یہ کہ حصول رزق اور کشادگی کی تلاش میں میری موت واقع ہو۔''[۳۲]

حقیقت یہ ہے کہ ایک آدمی کے ایمان وعبادت کا امتحان کاروبار دنیا ہی میں ہوتا ہے جہاں ہر قدم پر شیطانی وساوس اور نفس کی فتنہ انگیزیوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ مشہور تابعی ابراہیم نخعی سے کسی نے پوچھا کہ آپ ایک عبادت گزار صوفی اور ایک امانت دار تاجر میں سے کس کو ترجیح دیں گے۔ آپ نے فرمایا کہ امانت دار تاجر میرے نزدیک افضل ہے اس لیے کہ شیطان اسے بہرصورت ورغلاتا ہے، کبھی ناپ تول اور کبھی لین دین میں اسے الجھانے اور غلط راہ میں لے جانے کی کوشش کرتا ہے، لیکن وہ اسے برابر شکست دیتا رہتا ہے۔

ترک دنیا کا مطلب بندگان خدا کے حقوق کی ادائیگی سے فرار ہے اور یہ اسلام کی نظر میں عبادت نہیں، فعل گناہ ہے۔ اسلام میں جو عبادت مطلوب ہے وہ خدا کے حق کے ساتھ بندوں کے حقوق کو، جس میں نفس کا جائز حق بھی شامل ہے، احکام شریعت کے مطابق ادا کرنا ہے۔ ایک غزوہ میں کسی صحابی نے ایک ایسا غار دیکھا جو نہایت عمدہ جگہ پر واقع تھا۔ قریب ہی میں پانی کا چشمہ رواں تھا اور قرب وجوار میں خوش نما نباتات اگی ہوئی تھیں۔ صحابی مذکور کو یہ جگہ عبادت اور گوشہ نشینی کے لیے نہایت عمدہ معلوم ہوئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ کر عرض کیا، یا رسول اللہ! مجھ کو ایک غار ملا ہے، جو نہایت پسندیدہ ہے، وہاں ضرورت کی سب چیزیں بھی موجود ہیں۔ اجازت دیں کہ میں ترک دنیا کر کے وہاں جا بیٹھوں اور خدا کی عبادت کروں۔ آپ نے فرمایا، یہودیت اور عیسائیت لے کر دنیا میں نہیں

۳۲؎ سنن سعید بن منصور۔

آیا ہوں۔ میں جو ابراہیمی مذہب لایا ہوں وہ نہایت آسان، سہل اور بالکل واضح ہے۔[۳۳]

نفس کشی

ترک دنیا کی طرح اسلام میں نفس کشی کی بھی اجازت نہیں ہے۔ جائز حدود میں لذائذ دنیا سے متمتع ہونا خلاف عبادت تو کجا عین منشائے الٰہی ہے۔ فرمایا گیا ہے:

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ. (سورۂ اعراف ۷: ۳۲)

''پوچھو، کس نے حرام ٹھیرایا ہے اللہ کی اس زینت کو جسے اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کیا، اور رزق کی پاکیزہ چیزوں کو۔''

دور رسالت میں جب بعض صحابہ نے جوش عبادت میں نفس کشی کی راہ میں چلنا چاہا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس راہبانہ رجحان کی سختی کے ساتھ نفی فرمائی۔ ایک صحابی قدامہ بن مظعون اپنے ایک ساتھی کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا ''یا رسول اللہ ہم میں سے ایک نے عمر بھر مجرد رہنے اور دوسرے نے گوشت نہ کھانے کا ارادہ کر لیا ہے۔ آپ نے فرمایا، میں تو یہ دونوں باتیں کرتا ہوں۔ یہ سن کر دونوں صحابی اپنے خیال سے تائب ہو گئے۔[۳۴]

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص نے شادی کی اور وہ ایک صالح نوجوان تھے۔ نماز، روزہ اور تلاوت قرآن سے غیر معمولی شغف رکھتے تھے۔ ان کے والد عمرو ان کے گھر گئے تا کہ ان کی بیوی سے ان کا حال معلوم کریں کہ وہ کس طرح اس کے ساتھ رہتے ہیں۔ بیوی نے کہا: وہ اچھے آدمی ہیں، ہم نے ایک ساتھ ابھی تک بستر میں رات نہیں گزاری ہے۔ یہ سن کر عمرو نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی۔ عبداللہ بن عمرو خود روایت کرتے ہیں کہ جب میں خدمت اقدس میں پہنچا تو آپ نے کہا:

> ''مجھے معلوم ہوا کہ تم دن میں روزہ رکھتے ہو اور ساری رات تلاوت کرتے ہو۔ میں نے کہا، ہاں یہ بات سچ ہے یا رسول اللہ، لیکن اس سے بھلائی کے علاوہ اور میرا کوئی مقصود نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا، تم پر تمھاری بیوی کا بھی حق ہے، تمھارے مہمان کا بھی حق ہے اور تمھارے جسم کا بھی حق ہے۔ آپ نے مزید فرمایا کہ داؤد نبی اللہ کی طرح روزے رکھو کہ وہ بڑے عبادت گزار تھے۔ میں نے کہا، یا رسول اللہ، داؤد کا روزہ کیا ہے؟ فرمایا، وہ ایک دن ناغہ دے کر روزہ رکھتے تھے۔ مزید فرمایا کہ ایک مہینا میں قرآن ختم کیا کرو۔ میں نے کہا، میں اس سے زیادہ کی طاقت

۳۳؎ مسند ابن حنبل، ج ۵، ص ۲۶۶۔

۳۴؎ بخاری، کتاب الصوم۔

رکھتا ہوں۔فرمایا، بیس دن میں ختم کرلو۔ میں نے کہا، یارسول اللہ میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں۔فرمایا،تو دس دن میں۔ میں نے کہا، یارسول اللہ میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں۔فرمایا، اچھا تو سات دن میں ختم کیا کرو اور اس میں اضافہ نہ کرو۔تم پر تمھاری بیوی کا بھی حق ہے،تمھارے مہمان کا بھی حق ہے اور تمھارے جسم کا بھی حق ہے۔'' (بخاری، کتاب الصوم، باب: حق الجسم فی الصوم)

حضرت عثمان بن مظعون ایک عابد وزاہد صحابی تھے اور نہایت متقشفانہ زندگی بسر کرتے تھے۔آنحضور کو معلوم ہوا کہ وہ شب و روز ذکر و عبادت الٰہی میں مشغول رہتے ہیں اور اپنی بیوی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ دن کو روزہ رکھتے ہیں اور شب میں بہت کم سوتے ہیں۔آپ نے ان کو بلا کر پوچھا: عثمان! کیا تم میرے طریقہ سے ہٹ گئے ہو؟ انھوں نے عرض کیا، خدا کی قسم میں ہرگز آپ کے طریقہ سے نہیں ہٹا ہوں، میں تو آپ ہی کے طریقے پر چلنا چاہتا ہوں۔آپ نے فرمایا، عثمان خدا سے ڈرو کہ تمھارے اہل وعیال کا بھی تم پر حق ہے،تمھارے مہمان کا بھی تم پر حق ہے، تمھاری جان کا بھی تم پر حق ہے۔تم روزے بھی رکھو اور افطار بھی کرو، نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی۔[۳۵]

قبیلہ باہلہ کے ایک شخص نے اسلام قبول کیا تو ان صحابی نے دن کا کھانا چھوڑ دیا اور مسلسل روزے رکھنے لگے۔ ایک سال کے بعد جب وہ مدینہ آئے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے تو آپ ان کو پہچان نہ سکے کیونکہ مسلسل روزوں کی وجہ سے ان کی صورت بالکل بدل گئی تھی۔انھوں نے اپنا نام بتایا تو فرمایا،تم تو خوب رو تھے، یہ صورت کیسے بدل گئی؟ عرض کیا، یارسول اللہ، جب سے آپ سے مل کر گیا ہوں متصل روزے رکھتا ہوں۔فرمایا،تم نے اپنی جان کو کیوں عذاب میں ڈالا، رمضان کے علاوہ ہر مہینا میں ایک روزہ کافی ہے۔انھوں نے اس سے زیادہ کی طاقت ظاہر کی تو آپ نے مہینے میں دو روزے کی اجازت دی۔انھوں نے اس سے زیادہ کی اجازت چاہی تو مہینے میں تین روزے کردیے۔انھوں نے اس سے بھی زیادہ کی درخواست کی تو آپ نے ماہ حرام کے روزوں کی اجازت دی۔[۳۶]

ایک بار صحابہ کی ایک جماعت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کا حال معلوم کرنے ازواج مطہرات کے گھر پہنچی۔ ان کا گمان تھا کہ آپ ہر وقت سربسجود رہتے ہوں گے، رات بھر نمازیں پڑھتے ہوں گے،تمام دن روزے رکھتے ہوں گے، رات میں کم سوتے ہوں گے،جسم کو کم ہی آرام دیتے ہوں گے، اور عورتوں سے کوئی تعلق نہ رکھتے ہوں گے۔

۳۵؎ ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ باب: یومر به من القصد فی الصلوۃ۔

۳۶؎ ابوداؤد، کتاب الصوم، باب: فی صوم شهر الحرام۔

لیکن جب ازواج مطہرات نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کے بارے میں بتایا تو وہ ان کے ارادوں سے کم معلوم ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ ہم کو آنحضور سے کیا نسبت، اللہ نے آپ کی مغفرت فرما دی ہے ’وَقَدْ غَفَرَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ وَمَا تَاَخَّرَ‘ ان میں سے ایک نے کہا کہ میں ساری رات نماز پڑھوں گا، دوسرے نے کہا، میں عمر بھر روزے رکھوں گا اور کبھی ناغہ نہ کروں گا، تیسرے نے کہا، میں عورتوں سے الگ رہوں گا اور کبھی شادی نہ کروں گا۔ رسول اللہ نے جب ان کی باتیں سنیں تو ان کے پاس آئے اور فرمایا:

انتم القوم الذین قلتم کذا و کذا؟ واللّٰہ انی لاخشاکم اللّٰہ واتقاکم لہ. لکنی اصوم وافطر، واصلی وارقد، واتزوّج النساء، فمن رغب عن سنتی فلیس منی. (صحیح بخاری، کتاب النکاح)

’’کیا وہ تمھی لوگ ہو جنھوں نے اس قسم کی باتیں کی ہیں۔ خدا کی قسم میں تم سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہوں اور اس کی نافرمانی سے احتراز کرتا ہوں تاہم میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور ناغہ بھی کرتا ہوں، راتوں کو نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ جو میرے طریقے سے ہٹ گیا اس سے میرا کوئی تعلق نہیں۔‘‘

رہبانیت کے خلاف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ان مؤثر تعلیمات اور آپ کے اسوۂ حسنہ کے نتیجے میں اسلام کے ابتدائی دور میں شجر رہبانیت کو برگ و بار لانے کا موقع نہیں مل سکا۔ جب بھی کسی کے اندر اس قسم کا میلان پیدا ہوا تو خود صحابہ نے اس کو سختی کے ساتھ روکا۔ حضرت ابودرداء ایک مشہور عابد شب زندہ دار صحابی گزرے ہیں۔ رسول اللہ نے ان کے اور حضرت سلمان فارسی کے درمیان مواخات کا رشتہ قائم کیا تھا۔ ایک بار سلمان ان کی ملاقات کو گئے تو دیکھا کہ ان کی بیوی معمولی کپڑے پہنے ہوئے تھیں۔ پوچھا کیا معاملہ ہے؟ انھوں نے کہا، تمھارے بھائی ابودرداء کو دنیا سے کوئی رغبت نہیں ہے۔ جب ابودرداء آئے تو سلمان کے لیے کھانا لگایا گیا۔ انھوں نے سلمان سے کہا، تم کھاؤ میں روزے سے ہوں۔ انھوں نے کہا، میں اس وقت تک نہیں کھاؤں گا جب تک تم بھی شریک نہ ہو گے۔ چنانچہ وہ شریک طعام ہوئے۔ جب رات ہوئی تو ابودرداء نماز کے لیے کھڑے ہوئے۔ سلمان نے کہا، ابھی سو رہو، وہ مان گئے۔ وہ دوبارہ اٹھے تو کہا سو جاؤ۔ جب رات کا آخری پہر آ گیا تو سلمان نے ان کو بیدار کیا اور کہا اب نماز پڑھو۔ چنانچہ دونوں نے نماز ادا کی۔ اس کے بعد سلمان نے کہا، اے ابودرداء! تمھارے رب کا بھی تم پر حق ہے، تمھاری جان کا بھی تم پر حق ہے اور تمھاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے۔ اس لیے ہر حق دار کا حق اس کو ادا کرو۔ دوسرے دن

ابودرداء نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور ساری باتیں بیان کیں۔ آپ نے فرمایا، سلمان نے سچ کہا۔[۳۷]

ریاضات شاقہ

ہر قوم کے غالی مذہبی لوگوں کا یہ خیال رہا ہے کہ عبادت میں جتنی زیادہ جسمانی مشقتیں اٹھائی جائیں اور جسم کو اذیت میں مبتلا کیا جائے اتنا ہی زیادہ اللہ خوش اور راضی ہوتا ہے۔ اس سے پہلے عیسائی رہبان کی ریاضات شاقہ کا حال آپ پڑھ چکے ہیں۔ بعض مسلم صوفیاء بھی عیسائی رہبان کے نقش قدم پر چلے ہیں۔[۳۸] لیکن اسلام کی تعلیم اس معاملے میں نہایت سادہ، آسان اور مطابق فطرت ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

مَا جَعَلَ عَلَيۡكُمۡ فِى الدِّيۡنِ مِنۡ حَرَجٍ. (سورۂ حج ۲۲: ۷۸) ”اور اس نے دین کے معاملے میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔“

ایک دوسری جگہ وضو اور تیمّم کے ذکر کے بعد ارشاد ہوا ہے:

مَا يُرِيۡدُ اللّٰهُ لِيَجۡعَلَ عَلَيۡكُمۡ مِّنۡ حَرَجٍ وَّلٰـكِنۡ يُّرِيۡدُ لِيُطَهِّرَكُمۡ وَلِيُتِمَّ نِعۡمَتَهٗ عَلَيۡكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ. (سورۂ مائدہ ۵: ۶) ”اللہ یہ نہیں چاہتا کہ تم پر کوئی تنگی ڈالے بلکہ وہ چاہتا ہے کہ تمھیں پاک کرے اور تم پر اپنی نعمت تمام کرے تاکہ تم اس کے شکر گزار بنو۔“

ماہ صیام میں بیماری اور سفر کی حالت میں روزے کا حکم بیان کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے:

يُرِيۡدُ اللّٰهُ بِكُمُ الۡيُسۡرَ وَلَا يُرِيۡدُ بِكُمُ الۡعُسۡرَ وَلِتُكۡمِلُوا الۡعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰٮكُمۡ وَلَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ. (سورۂ بقرہ ۲: ۱۸۵) ”اللہ تمھارے لیے آسانی چاہتا ہے، تمھارے ساتھ سختی نہیں کرنا چاہتا۔ وہ تو چاہتا ہے کہ تم تعداد پوری کرو اور اللہ نے جو ہدایت تمھیں بخشی ہے اس پر اس کی بڑائی کرو، اور تاکہ تم اس کے شکر گزار بنو۔“

۳۷؎ بخاری، کتاب الادب۔

۳۸؎ ایک صوفی بزرگ بیس سال تک مستقل کھڑے رہے صرف نماز میں تشہد کے لیے بیٹھے تھے (کشف المحجوب ص ۲۹۲) سری ایک بڑے عبادت گزار صوفی گزرے ہیں۔ وہ اٹھانوے برس تک زندہ رہے اور سوائے مرض الموت کے کبھی لیٹے نہیں (احیاء العلوم ج ۴ ص ۳۴۹) ایک چشتی بزرگ خواجہ ابومحمد اپنے مکان کے ایک گہرے کنویں میں الٹا لٹک کر عبادت میں مصروف رہتے تھے (سیر الاولیاء ص ۴۰) مزید معلومات کے لیے قارئین ابن الجوزی کی کتاب ”تلبیس ابلیس“ ملاحظہ کریں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متعدد ارشادات میں صحابہ کو تلقین کی ہے کہ وہ دین میں میانہ روی اختیار کریں اور عبادت میں غیر ضروری مشقت سے کام نہ لیں کہ یہ عیسائی رہبان کا طریقہ ہے، فرمایا:

ان الدین یسر، ولن یشاد الدین احد الا غلبه فسددوا وقاربوا وأبشروا الخ.

(رواہ البخاری، کتاب الایمان، باب: الدین یسر)

''دین آسان ہے، جو کوئی دین میں سختی اختیار کرے گا تو وہ اس پر غالب آجائے گا۔ پس راہ راست پر قائم رہو، میانہ روی اختیار کرو اور خوش خبری دو۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت معاذ بن جبل اور حضرت ابوموسیٰ اشعری کو یمن کا امیر بنا کر بھیجا تو دوسری باتوں کے علاوہ یہ نصیحت بھی کی:

یسرا ولا تعسرا وبشرا ولا تنفرا وتطاوعا ولا تختلفا.

(رواہ البخاری، کتاب الایمان، باب: الدین یسر)

''تم دونوں آسانی پیدا کرنا، تنگی پیدا نہ کرنا، خوش خبری دینا، نفرت نہ دلانا، اور خوشی سے ایک دوسرے کی تابعداری کرنا، اختلاف نہ کرنا۔''

آسانی اور سادگی ہی اسلام کی روح ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

الا هلك المتنطعون، الا هلك المتنطعون، الا هلك المتنطعون.

(رواہ مسلم واحمد وابوداؤد)

''سن لو، غلو کرنے والے ہلاک ہوئے، سن لو، غلو کرنے والے ہلاک ہوئے، سن لو غلو کرنے والے ہلاک ہوئے۔''

اسلام میں وہی عبادت محمود ہے جو آسانی کے ساتھ مگر پابندی سے کی جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اکلفوا من العمل ما تطیقون فان اللّٰه لا یمل حتی تملوا، فان احب العمل الی اللّٰه ادومه وان قل.

(ابوداؤد، باب: القصد فی الصلوٰۃ)

''اتنے ہی کام کی تکلیف اٹھاؤ، جس کو بآسانی کر سکو کیونکہ جب تک تم نہ اکتا جاؤ خدا نہیں اکتاتا۔ خدا کے نزدیک سب سے پسندیدہ کام وہ ہے جو برابر انجام پائے اگرچہ قلیل ہو۔''

حضرت عائشہ نے جب رسول اللہ کو بتایا کہ خولاء بنت تویت نے پختہ ارادہ کر لیا ہے کہ وہ رات بھر نہیں سوئے گی اور عبادت کرے گی تو آپ نے فرمایا:

لا تنام اللیل؟ خذوا من العمل ما تطیعون، فو اللّٰه لا یسأم اللّٰه حتی تسأموا.

''رات میں نہیں سوئے گی؟ اتنا ہی عمل کرو جتنے کی طاقت رکھتے ہو۔ خدا کی قسم اللہ نہیں اکتاتا جب تک کہ تم نہ اکتا جاؤ۔''

(رواہ البخاری، باب: التہجد باللیل، باب: ما یکرہ من التشدید فی العبادۃ)

انس روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک رسی دوستونوں کے درمیان بندھی ہوئی ہے۔ پوچھا یہ کیا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ زینب کی رسی ہے۔ دوران نماز جب وہ تھکن محسوس کرتی ہیں یا وقفہ دینا چاہتی ہیں تو اس کو پکڑ لیتی ہیں۔ فرمایا، اس کو کھول دو۔ تم میں سے ہر شخص کو اس وقت تک نماز پڑھنا چاہیے جب تک طبیعت میں تازگی محسوس ہو۔ جب تھک جاؤ یا وقفہ دینا چاہو تو بیٹھ جاؤ۔[39]

ایام جاہلیت میں مناسک حج کے اندر بعض باتیں رہبانیت کی داخل ہوگئی تھیں، جو دراصل عیسائی رہبان کے اثرات کا نتیجہ تھیں۔ اسلام کے بعد بھی بعض لوگ ان اثرات سے آزاد نہیں ہو سکے تھے۔ چنانچہ حضرت عقبہ بن عامر کی بہن نے یہ نذر مانی کہ وہ پیدل چل کر حج کریں گی۔ عقبہ نے اس بارے میں رسول اللہ سے پوچھا تو آپ نے فرمایا، خدا کو تمھاری بہن کی اس نذر کی ضرورت نہیں ہے۔ ان سے کہو کہ وہ سوار ہو کر حج کریں۔[40]

آپ نے دیکھا کہ ایک شخص بڑھاپے کی وجہ سے چل نہیں سکتا، اس کے بیٹے دونوں طرف سے اس کو پکڑے ہوئے چلا رہے تھے۔ آپ نے پوچھا تو معلوم ہوا کہ اس نے پیدل حج کی نیت کی ہے۔ فرمایا، خدا کو اس کی ضرورت نہیں کہ وہ اپنی جان کو عذاب میں ڈالے، اس کو سوار کر دو۔[41] اسی طرح ایک دفعہ آپ خطبہ دے رہے تھے تو دیکھا کہ ایک شخص چلچلاتی دھوپ میں ننگے سر کھڑا ہے۔ آپ نے پوچھا، یہ کون شخص ہے اور وہ کیوں دھوپ میں کھڑا ہے؟ صحابہ نے بتایا کہ اس کا نام ابو اسرائیل ہے۔ اس نے نذر مانی ہے کہ وہ کھڑا رہے گا، بیٹھے گا نہیں اور نہ سایہ میں آرام کرے گا اور نہ بات کرے گا اور برابر روزے رکھے گا۔ آپ نے فرمایا، اس سے کہو کہ باتیں کرے، بیٹھے، سایہ میں آرام کرے اور اپنا روزہ پورا کرے۔[42]

عمار بن یاسر بیان کرتے ہیں کہ ہم ایک غزوہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ نہایت گرمی کے دنوں میں سفر شروع ہوا تھا۔ راستے میں ہم ایک جگہ ٹھہرے۔ ہم میں سے ایک شخص نکلا اور جلدی سے درخت کے سائے میں

---

۳۹ رواہ البخاری، باب: التہجد باللیل، باب: ما یکرہ من التشدید فی العبادۃ۔

۴۰ سنن ابی داؤد، کتاب الایمان والنذور، باب: من رای علیہ کفارۃ اذا کان فی معصیۃ۔

۴۱ ایضاً، مزید دیکھیں بخاری، کتاب الایمان والنذور، باب: النذر فیما لا یملک وفی معصیۃ۔

۴۲ صحیح بخاری، کتاب الایمان والنذور، باب: النذر فیما لا یملک وفی معصیۃ۔

چلا گیا۔ دوسرے لوگ تو درخت کے سائے میں آرام کر رہے تھے اور وہ اس طرح سویا ہوا تھا جیسے اذیت میں مبتلا ہو۔ رسول اللہ نے دیکھا تو پوچھا، تمھارے ساتھی کو کیا ہوا ہے؟ لوگوں نے کہا، وہ روزے سے ہے۔ آپ نے فرمایا:

لیس من البر ان تصوموا فی السفر وعلیکم بالرخصة التی رخص اللّٰه لکم فاقبلوها. (رواہ الطبرانی فی الکبیر باسناد حسن)

''یہ کوئی نیکی نہیں ہے کہ تم سفر میں روزہ رکھو، اللہ کی دی ہوئی رخصت کو لازم جانو اور اس پر عمل کرو۔''

حضرت انس سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ کے ساتھ ایک سفر میں تھے۔ ہم میں روزہ دار بھی تھے اور بے روزہ دار بھی۔ ہم نے ایک منزل پر قیام کیا۔ دن نہایت گرم تھا۔ جو روزہ دار تھے وہ تو زمین پر پڑ رہے اور جو لوگ روزہ سے نہیں تھے انھوں نے خیمے نصب کیے اور جانوروں کو پانی پلایا۔ یہ دیکھ کر رسول اللہ نے فرمایا:

ذهب المفطرون الیوم بالاجر.

''آج اجر میں بے روزہ دار بازی لے گئے۔''

(رواہ احمد و مسلم و ابوداؤد)

ابوداؤد روایت کرتے ہیں کہ وہ اور ان کے والد حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانۂ امارت میں انس بن مالک کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت وہ نماز پڑھ رہے تھے، نہایت ہلکی نماز گویا کہ مسافر کی نماز ہو۔ جب انھوں نے سلام پھیرا تو والد نے پوچھا: اللہ آپ پر رحم کرے، کیا یہ فرض نماز تھی یا نفل؟ انھوں نے کہا، یہ فرض نماز تھی، اور یہ رسول اللہ کی نماز تھی۔ میں نے اس میں کوئی خطا نہیں کی ہے بجز بھول چوک کے۔ رسول اللہ فرماتے تھے:

لاتشددوا علی انفسکم فشدد علیکم، فان قوما شددوا علی انفسهم فشدد اللّٰه علیهم، فتلك بقایاهم فی الصوامع والدیار: رهبانیة ابتدعوها ما کتبنا علیهم.

''اپنی جانوں پر سختی نہ کرو کہ وہ تم پر سختی کرے۔ ایک قوم نے اپنے نفوس پر سختی کی تو اللہ نے ان پر سختی فرمائی۔ یہ صومعے اور خانقاہیں ان ہی کی یادگار ہیں۔ پھر یہ آیت پڑھی: 'رهبانیة ابتدعوها الخ'[۴۳]۔''

(سنن ابوداؤد، کتاب الادب، باب: فی الحد)

انس بن مالک روایت کرتے ہیں کہ معاذ بن جبل ایک قبیلے کے امام تھے۔ حرام (ابن ملحان) نماز سے فارغ ہو کر اپنے باغ کو سینچنا چاہتے تھے۔ چنانچہ وہ لوگوں کے ساتھ مسجد میں داخل ہوئے اور نماز میں شریک ہو گئے، لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ معاذ نماز کو طول دے رہے ہیں تو وہ نماز مختصر کر کے اپنے باغ کو چلے گئے تاکہ اس کو سینچیں۔

---

[۴۳] سورۂ حدید ۲۷۔

جب معاذ نے نماز ختم کی تو انھیں یہ بات بتائی گئی۔ یہ سن کر انھوں نے کہا کہ وہ منافق ہے۔ کیا وہ باغ کو سینچنے کے لیے نماز میں عجلت کرتا ہے۔ جب حرام کو یہ بات معلوم ہوئی تو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے (اور معاذ بھی آئے) اور کہا: اے اللہ کے نبی، میرا ارادہ یہ تھا کہ اپنے باغ کو سینچوں۔ چنانچہ میں مسجد میں آیا تا کہ لوگوں کے ساتھ نماز پڑھوں، لیکن جب انھوں (معاذ) نے نماز کو طول دیا تو میں اپنی نماز مختصر کر کے باغ میں چلا گیا تا کہ اسے سینچوں۔ انھوں نے اس سے یہ سمجھ لیا کہ میں منافق ہوں۔ یہ سن کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ کی طرف دیکھا اور فرمایا، کیا تو فتنہ پھیلانے والا ہے، کیا تو فتنہ پھیلانے والا ہے؟ 'أفتان انت، أفتان انت' ان کو لمبی نماز نہ پڑھایا کرو۔ 'سبح اسم ربك الاعلیٰ' اور 'واشمس و ضحاها' وغیرہ پڑھایا کرو۔[۴۴]

دیکھیں کہ ایک شخص طول نماز کی وجہ سے اپنی نماز مختصر کر کے جماعت سے الگ ہو جاتا ہے، لیکن رسول اللہ اس کو ذرا بھی ملامت نہیں کرتے بلکہ الٹا حضرت معاذ بن جبل جیسے صحابی کو تنبیہ فرماتے ہیں اور یہ سخت الفاظ ارشاد فرماتے ہیں: 'أفتان انت، أفتان انت'؟

اس واقعے سے صاف طور پر دین اسلام کا مزاج معلوم ہو جاتا ہے۔ اور وہ مزاج یہ ہے کہ عادت میں غلو سے پرہیز کیا جائے۔ اللہ کو اپنے بندوں سے جسمانی ریاضتیں نہیں، تقویٰ مطلوب ہے۔ یہ غلو ہی تو تھا جس نے ماضی میں قوموں کو ہلاک کیا ہے، ابن عباس فرماتے ہیں:

ایاکم والغلو، فان اهلك من كان قبلكم الغلو. (رواه مسلم)	''غلو سے بچو، تم سے پہلے جو لوگ گزرے ہیں ان کو غلو ہی نے ہلاک کیا۔''

[باقی]

۴۴؎ رواہ احمد باسناد صحیح۔ یہ قصہ صحیحین وغیرہ میں بھی لفظی فرق کے ساتھ مذکور ہے۔ دیکھیں بخاری، باب: اذا طول الامام وکان للرجل حاجۃ۔

ریحان احمد یوسفی

عذراوراعتراف

قرآن کریم میں حضرت آدم علیہ السلام اورابلیس کا واقعہ بیان ہوا ہے۔اس واقعے کی جوتفصیلات قرآن پاک کی مختلف سورتوں میں بیان ہوئی ہیں ان کے مطابق اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کوزمین پر خلیفہ بنایا۔پھر فرشتوں کوحکم دیا کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کوسجدہ کریں۔فرشتوں نے سجدہ کیا۔مگراس موقع پر موجودایک جن نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو ماننے سے انکار کردیا۔یہ ابلیس تھا جو بعد میں شیطان کے نام سے مشہور ہوا۔

جب اللہ تعالیٰ نے شیطان سے پوچھا کہ کس چیز نے تجھے میرا حکم ماننے سے روکا تو اس نے ایک خوبصورت عذر پیش کردیا۔وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے خود اسے ایک برتر حیثیت میں پیدا کیا ہے،یعنی اس کی پیدایش آگ سے ہوئی،جبکہ جس ہستی کے سامنے اسے سجدے کا حکم دیا گیا ہے،اس کی پیدایش ایک کم تر مادے یعنی مٹی سے کی گئی ہے۔چنانچہ ایک طرف تو اسے برتر بنایا گیااور دوسری طرف اسے ایک کم تر مخلوق کے سامنے جھکنے کا حکم دیا جارہا ہے۔اس لیے خرابی اس کے انکار میں نہیں،بلکہ اس حکم میں ہے جس میں بظاہر ایک غلط مطالبہ کیا گیا ہے۔

یہ شیطان کا مقدمہ تھا جو بظاہر بہت مضبوط اور مدلل تھا۔مگر وہ کسی اور کے سامنے نہیں،بلکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے موجود تھا،جو دلوں کے بھید تک جانتا ہے۔چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کے دل کی اصل حالت کو بیان کردیا کہ تو دراصل تکبر کا شکار ہو چکا ہے۔اوراس تکبر نے تجھے اس طرح اندھا کیا ہے کہ تو میرے سامنے بغاوت پر تیار ہوگیا ہے۔اس لیے اب تجھے راندۂ درگاہ کیا جاتا ہے۔

شیطان اس موقع پربھی سرکشی سے باز نہ آیا۔اس نے اپنی گمراہی کا الزام یہ کہہ کراللہ تعالیٰ پرڈالنے کی کوشش کی کہ جس طرح تو نے مجھے گمراہ کیا ہے،میں آدم اوراس کی اولاد کوگمراہ کروں گا۔اس طرح یہ ثابت ہوجائے گا کہ وہ

اس عزت کے مستحق نہ تھے جو انھیں دی گئی ہے۔ بس تو مجھے قیامت کے دن تک کی مہلت دے دے۔ اللہ تعالیٰ شیطان سے سخت ناراض تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسے مہلت دے دی تاکہ اس کی بدی اس طرح واضح ہو جائے کہ خدا کی رحمت جیسی بلند صفت بھی اس کے کام نہ آسکے۔

دوسری طرف حضرت آدم کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ اپنی بیگم کے ہمراہ ایک باغ میں قیام کریں۔ البتہ ایک خاص درخت سے دور رہیں۔ اور انھیں یہ بھی بتا دیا کہ یہ ابلیس ان کا دشمن ہے۔ لہٰذا وہ اس کے دھوکے میں نہ آئیں۔ حضرت آدم و حوا کچھ عرصہ تو اللہ کے حکم کے پابند رہے، مگر آہستہ آہستہ شیطان نے وسوسہ انگیزی شروع کر دی۔ اس نے ان دونوں کو قسم کھا کر یہ یقین دلا دیا کہ وہ اس درخت کا پھل کھا لیں تو انھیں ہر طرح سے فائدہ ہوگا۔ وہ دونوں اس کی باتوں میں آگئے اور اس درخت کا پھل کھا بیٹھے۔ مگر اس کے نتیجے میں فوراً وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں سے محروم ہو گئے۔ یوں بظاہر شیطان اپنے اس چیلنج میں کامیاب ہو گیا کہ وہ یہ ثابت کر کے رہے گا کہ آدم اس مقام کے مستحق نہیں ہیں جو انھیں دیا گیا ہے۔

مگر آدم و حوا کا کیس شیطان والا نہیں تھا۔ انھوں نے اس کا پہلا ثبوت یہ دیا کہ جیسے ہی انھیں احساس ہوا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر قائم نہیں رہ سکے، دونوں رب کی بارگاہ میں معافی کے خواستگار ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ کیا میں نے تمھیں منع نہیں کیا تھا۔ یہ دوسرا موقع تھا جب حضرت آدم نے شیطان سے مختلف ہونے کا ثبوت دیا۔ انھوں نے شیطان کی طرح اپنے عمل کی کوئی تاویل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ حالانکہ وہ دونوں یہ کہہ سکتے تھے کہ ہمیں شیطان نے دھوکا دیا ہے۔ مگر انھوں نے کوئی عذر پیش نہ کیا اور یکطرفہ طور پر ساری غلطی قبول کر لی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انھیں معاف کر دیا۔

آج بھی ابن آدم اور ابن شیطان میں ایک ہی بنیادی فرق ہوتا ہے۔ آدم کے بیٹے اعتراف کی نفسیات میں جیتے ہیں، جبکہ شیطان کے پیروکار عذر کی نفسیات میں۔ پہلوں سے جب کوئی غلطی ہوتی ہے تو وہ کسی توجہ دلانے سے قبل ہی غلطی مان لیتے ہیں۔ دوسروں سے جب کوئی غلطی ہوتی ہے تو وہ فوراً کوئی تاویل سوچتے ہیں۔ پہلوں سے کوئی بھول ہوتی ہے تو اپنے اس عذر کو بھی استعمال کرنے میں جھجکتے ہیں جو وہ بجا طور پر پیش کر سکتے ہیں۔ دوسرے اپنے ہر جرم کا الزام دوسروں پر ڈال کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔

ان دو گروہوں کا رویہ اگر اپنے اپنے پیش رو جیسا ہے تو ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا رویہ بھی وہی ہے۔ ابن آدم کی ہر بھول اور ہر غلطی معاف کر دی جاتی ہے، جبکہ شیطان کا رویہ اختیار کرنے والے انسانوں سے اللہ تعالیٰ ناراض

ہو جاتے ہیں۔ پہلوں کو جنت کی بادشاہی میں اعلیٰ مقام دیا جائے گا۔ دوسروں کو جہنم کی آگ کا ایندھن بنا دیا جائے گا۔

محمد وسیم اختر مفتی

اے کاش

’’میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس کائنات میں بکھرے ہوئے تمام دکھی لوگوں کے دکھ اپنے دامن میں سمیٹ لوں۔ان لوگوں کی پلکوں پر لرزتے ہوئے آنسو ایک ایک کر کے اپنے دل میں اتار لوں اور خود ایک سمندر بن جاؤں۔میرا ظرف اتنا اعلیٰ ہو جائے کہ بڑی سے بڑی خطا درگزر کروں۔اپنی خواہش کو مٹا دوں،میری ذات دوسروں کے لیے وقف ہو کر رہ جائے۔‘‘(امجد کرن سندھو۔پھول کلیاں: ۲ جنوری ۲۰۰۳ء)

یہ ایک بچے کی تحریر ہے جو بچوں کے ہفتہ وار اخبار میں چھپی۔لکھنے والے کا کرب انتہائی اس اقتباس میں نمایاں ہے، نوع انساں سے بے پایاں ہمدردی بھی اس میں جھلکتی ہے۔بچوں کے احساسات خالص ہوتے ہیں۔وہ مفادات کی دوڑ میں شامل نہیں ہوتے اور ردعمل کی نفسیات سے بھی محفوظ ہوتے ہیں۔یہ دو محرکات بڑوں کی زندگی میں اہم رول ادا کرتے ہیں،مفادات انھیں انتہائی اقدام پر اکسا دیتے اور ردعمل ناگزیر کام سے بھی گریز پر مجبور کر دیتا ہے۔انھی عوامل کے زیر اثر حق غیر مطلوب ہو جاتا ہے اور ناحق عین حق بن جاتا ہے۔جب ہم بچے تھے،ایسی معصوم خواہشیں اور اس طرح کے دردمندانہ خیالات ہمارے دل میں بھی آتے تھے لیکن بڑے ہوئے تو دوسری بچگانہ خواہشوں کے ساتھ یہ خیالات آنے بھی بند ہو گئے۔ایسے لگتا ہے ہماری رقت جاتی رہی ہے اور ایک خشونت نے اس کی جگہ لے لی ہے۔ہم نے عملیت پسندی کو خشونت کا نام دے کر چھپانا شروع کر دیا ہے۔دوسروں کا درد محسوس کرنا،اس کو اپنا کرب بنا لینا اور اس احساس کو بانٹنے کی کوشش کرنا اعلیٰ انسانی جذبہ ہے۔بچوں سے بڑھ کر اسے بڑوں میں ہونا چاہیے لیکن کیا وجہ ہے کہ بڑوں میں یہ قریب قریب مفقود ہو گیا ہے؟

انسان غیر محدود خواہشیں لے کر پیدا ہوا ہے لیکن اس کی صلاحیتیں محدود ہیں۔وہ پر نہیں لیکن تخیل پرواز رکھتا

ہے۔خاکی ہے مگراس کی نظرافلاک پر ہے۔ وہ زمین پر رہ کرسماوی خواہشیں پوری کرنا چاہتا ہے حالاں کہ زمین و آسمان میں بہت بعد ہے۔خواہشات اور حقائق کے اس تفاوت کی وجہ سے تمنائیں دم توڑتی ہیں اور آرزوؤں کا خون ہوتا ہے۔ کچھ لوگ مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں، وہ آرزو کو کارعبث سمجھنے لگتے ہیں اور انھیں ہر طرف تاریکی نظر آنے لگتی ہے۔ پھر یہ اسی یاسیت میں اپنی زندگی گزار دیتے ہیں، آدرش اور اعلیٰ انسانی مقاصد سے انھیں کوئی واسطہ نہیں رہتا۔ یہ دوسروں کا بھلا کیا کریں گے، خود بھی ڈانوڈول رہتے ہیں۔ اس کے برعکس کچھ افراد بے حس اور خود غرض بن جاتے ہیں۔ وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ پوری مخلوق کا بھلا کرنا ممکن نہیں، ہاں اپنی کھال میں مست ہوا جا سکتا ہے۔ ایسے لوگ ہر طریقے سے خواہشیں پوری کر لینا اپنا وتیرہ بنا لیتے ہیں۔ دوست دوست کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے سے دریغ نہیں کرتا اور اپنا مطلب پورا کرنے کے لیے بھائی بھائی کا خون کر دیتا ہے۔ بدقسمتی سے دنیا ایسے لوگوں سے بھری پڑی ہے مگر ایسے اشخاص بھی مل جاتے ہیں جو انسانیت سے ناتا توڑنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ ان کی ہر طرح کوشش ہوتی ہے کہ بلند اقدار پر قائم رہا جائے۔ وہ بہت حد تک کامیاب بھی رہتے ہیں لیکن اس دنیا کے کوتاہ وسائل کی طرح یہاں کا انسان بھی محدود قویٰ رکھتا ہے، اپنی حدود سے آگے جانا اور وسائل سے بڑھ کر کام کرنا اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ ہاں کچھ مثالیں ایسے لوگوں کی مل جاتی ہیں جو بظاہر اپنی طاقت اور میسر ذرائع سے ماورا ہو کر کام کرتے ہیں۔ یہ جن دیو نہیں بلکہ اپنی دھن کے پکے، لگن کے سچے انسان ہی ہوتے ہیں جو اپنے جنون (dedication) اور اپنی بے خودی و وارفتگی سے ایک مقام پا جاتے ہیں۔ ایسے دیوانے ہر مذہب اور نظریے کے لوگوں میں ملتے ہیں۔ دہریے طاغوت و لادینیت کی خاطر اور مشرکین معبودان باطلہ کی رضاجوئی کے لیے تن من کی بازی لگا دیتے ہیں۔ ہونا چاہیے کہ خدا پرستوں کی صفیں اس طرح کے افراد سے بھری ہوں لیکن افسوس جب سے عشق کی آگ بجھی ہے، اندھیر ہو گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ انصار مدینہ کی صفت بیان فرماتے ہیں۔'وَ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ'، ''اور یہ اپنے آپ پر (مہاجرین یا دوسرے اہل ایمان کو) ترجیح دیتے ہیں خواہ خود محتاجی کا شکار ہوں''۔ (الحشر ۵۹: ۹) جب مکہ سے اہل ایمان ہجرت کر کے مدینے آئے، انصار نے اپنے باغات، اپنی تجارتوں اور اپنے مویشیوں میں مہاجرین کو حصہ دار بنا لیا۔ پھر جب یہودی اپنی جائدادیں چھوڑ کر مدینہ سے گئے اور بحرین کا علاقہ اسلامی مملکت میں شامل ہوا تو انصار نے یہ سب کچھ بھی مہاجرین کو دے دیا، صرف دو تین غریب انصاریوں نے کچھ حصہ لیا۔ انصار کی یہ بے مثال قربانی بعد کے مسلمانوں کے لیے ایک قابل تقلید نمونہ بنی۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے، ایک

مہمان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو آپ نے اپنی ازواج کے پاس پیغام بھیجا۔ وہاں سے جواب ملا، ہمارے پاس مہمانی کے لیے صرف پانی ہی ہے۔ تب آپ نے دریافت فرمایا، کون اس شخص کی مہمان نوازی کرے گا؟ ایک انصاری، ابوطلحہؓ نے ذمہ داری اٹھائی اور اپنے گھر لے جا کر بیوی سے کہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مہمان کی خاطر مدارات کرو۔ اس نے کہا ہمارے پاس تو صرف بچوں کا کھانا ہے۔ انصاری نے کہا کھانا تیار کرو اور بچوں کو سلا دو۔ جب وہ مہمان کے ساتھ کھانے بیٹھے تو بہانے سے چراغ گل کر دیا، خود بھوکے سوئے اور اپنے حصے کا کھانا مہمان کو کھلا دیا۔ (بخاری: ۳۷۹۸) حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں، ایک صحابی کے گھر تحفے میں بکری کی سری آئی تو انھوں نے یہ کہہ کر اپنے ہمسائے کے ہاں بھیج دی کہ میرا وہ بھائی اور اس کا کنبہ مجھ سے زیادہ ضرورت مند ہے۔ اس نے بھی یہی الفاظ کہے اور سری اگلے ہمسائے کے گھر روانہ کی، اس طرح سات گھروں سے ہوتی ہوئی وہ واپس پہلے گھر میں آ گئی۔ (مستدرک حاکم: ۳۷۹۹)

حقیقت میں مہمان نوازی ازل سے انسانی نفسیات میں رچی بسی ہے۔ ہر قبائلی سوسائٹی میں مہمان کی ضرورت کو مقدم رکھا جاتا ہے چاہے اس کے لیے پیٹ پر پتھر کیوں نہ باندھنا پڑے۔ شہری تہذیبوں میں یہ روایت دم توڑ رہی ہے کیوں کہ معاش پیچیدہ ہونے کی وجہ سے شہروں میں آپا دھاپی کا ماحول ہوتا ہے اور ہر آدمی اپنی الجھنوں میں گرفتار ہوتا ہے۔ رشتوں کے کم زور پڑنے سے اس روایت میز بانی یا جذبہ قربانی پر کاری ضرب لگی، البتہ تکلف کچھ مہذب معاشروں میں رواج پا گیا۔ ''پہلے آپ، پہلے آپ'' اسی تہذیب کا ثمرہ ہے۔ ٹھوس بنیادیں نہ رکھنے کی وجہ سے یہ بھی مؤثر روایت نہ بن سکا۔ دوسروں کے دکھ درد کو محسوس کرنا اور اس کو بانٹنا کئی شعبے رکھتا ہے۔ اسی قبیل میں بچوں، بوڑھوں اور کم زوروں کا خیال رکھنا آتا ہے۔ مذہب وملت سے قطع نظر انسانی ہم دردی رکھنا اسی کا اہم جزو ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ روایت فرماتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''الراحمون یرحمہم الرحمٰن، ارحموا أهل الأرض یرحمکم من فی السماء۔ رحم کرنے والوں پر خدائے رحمان رحم فرماتا ہے۔ اہل زمین پر رحم کرو، جو آسمان میں ہے وہ تم پر رحم کرے گا''۔ (ترمذی: ۱۹۲۴) یہ دردمندی جانوروں کو بھی ایذا پہنچانے سے روکتی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ایک آدمی کو دوران سفر میں سخت پیاس لگی تو اس نے ایک کنویں میں اتر کر پانی پیا۔ جب وہ نکلا تو اس نے دیکھا کہ ایک کتا پیاس کی شدت سے گیلی مٹی چاٹ رہا ہے۔ اس نے سوچا کہ اس کتے کو پیاس سے اسی طرح تکلیف ہو رہی ہے جیسے مجھے ہوئی تھی۔ وہ پھر کنویں میں اترا، اپنی جوتی کو پانی سے بھرا، اسے منہ میں دبا کر باہر نکلا اور کتے کو پانی پلا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی نیکی کو قبول

کرتے ہوئے اس کی بخشش کر دی۔ حاضرین صحابہ نے پوچھا، کیا جانوروں سے نیکی کا بھی ہمیں صلہ ملے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ''ہر جگر تر (زندہ جان) میں اجر ملے گا۔'' (مسلم: ۵۸۵۹)

دوسروں کے درد کو محسوس کرنا، ان کے دکھوں کا مداوا کرنا اور کسی ذی روح کی تکلیف کو اپنا کرب بنا لینا انتہائی بلند انسانی جذبہ ہے۔ کاش یہ الفاظ ایک بچے کے بجائے کسی بڑے کے قلم سے نکلے ہوتے ''میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس کائنات میں بکھرے ہوئے تمام دکھی لوگوں کے دکھ اپنے دامن میں سمیٹ لوں۔ ان لوگوں کی پلکوں پر لرزتے ہوئے آنسو ایک ایک کر کے اپنے دل میں اتار لوں اور خود ایک سمندر بن جاؤں۔ میرا ظرف اتنا اعلیٰ ہو جائے کہ بڑی سے بڑی خطا درگزر کروں۔ اپنی خواہش کو مٹا دوں، میری ذات دوسروں کے لیے وقف ہو کر رہ جائے۔''

محمد عمار خان ناصر

متفرق سوالات

[جدید تعلیم یافتہ خواتین کی ایک نشست میں کیے جانے والے سوال و جواب]

سوال: مرد خود کما سکتے ہیں جبکہ خواتین نہیں کماتیں۔ اس لحاظ سے ان کو ترکے میں مردوں کی نسبت زیادہ حصہ ملنا چاہیے نہ کہ کم؟

جواب: دیکھیں، حکم کی علت پہلے متعین کرنی پڑتی ہے۔ آدمی کے مرنے کے بعد اس کا مال جن لوگوں کو ملنا ہے تو آپ کس principle پر ان کو دیں گے؟ اگر تو اصول یہ ہے کہ جو زیادہ ضرورت مند ہے، اس کو زیادہ ملنا چاہیے تو پھر آپ کی بات درست ہے۔ قرآن نے تو بیان کیا ہے کہ وہ ترکے کو ضرورت اور حاجت کے اصول پر تقسیم نہیں کر رہا۔ وہ منفعت کے اصول پر کر رہا ہے۔ معاشرے میں رہتے ہوئے انسان کو جس رشتہ دار سے زیادہ منفعت مل سکتی ہے، بالقوۃ یا بالفعل، قرآن چاہتا ہے کہ اس کو زیادہ ملے۔ یہ تقسیم ضرورت کے اصول پر نہیں ہے۔ ضرورت کے دائرے میں اس نے آپ کو وصیت کا حق دیا ہے۔ تو اصل میں اصول بدل گیا ہے۔ اصول اگر وہ ہوتا تو آپ کی بات ٹھیک تھی۔ قرآن کہتا ہے کہ ترکے کی تقسیم کا اصول اللہ کے نزدیک یہ نہیں ہے۔ اصول یہ ہے کہ جس سے زیادہ منفعت مل رہی ہے، اس کو زیادہ حصہ ملے گا۔

سوال: مرد اور عورتوں کے حصوں میں فرق کی جو حکمت آپ نے بیان کی ہے، وہ سمجھ میں نہیں آتی؟

جواب: دیکھیں، جب بھی کسی دینی حکم کو ہم سمجھتے ہیں یا اس کو interpret کرتے ہیں تو اس کے دو مرحلے ہوتے ہیں۔ پہلا مرحلہ ہوتا ہے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کا۔ دین میں ترتیب یوں نہیں ہے کہ پہلے آپ حکم کا

rationale سمجھیں اور پھر اس کو قبول کریں۔ اس کے برعکس دین میں آپ پہلے حکم کو مانتے ہیں کہ یہ خدا کا حکم ہے اور پھر اس کی حکمت سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً اگر وراثت میں خدا کا حکم نہ ہوتا تو ہم بالکل آزاد ہوتے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ایک روایت میں یہ بھی بیان کیا ہے کہ بچوں میں جب تحفے تحائف تقسیم کرو تو برابری ملحوظ رکھا کرو۔ بیٹے اور بیٹی میں امتیاز نہیں ہونا چاہیے، بلکہ آپ نے اپنا رجحان یہ بیان کیا کہ اگر برابری کا اصول مانع نہ ہوتا تو میرا یہ جی چاہتا تھا کہ میں بیٹیوں کو زیادہ دوں۔ تو اگر یہاں وراثت کے معاملے میں خدا نے اپنا اصول بیان نہ کیا ہوتا کہ اس اصول پر ترکہ تقسیم ہونا چاہیے اور حصوں کا تناسب نہ بیان کیا ہوتا تو ہمیں یہ فیصلہ کرنے کا پورا حق ہوتا کہ چونکہ ضرورت عورت کو زیادہ ہے، اس لیے ہم اس کو زیادہ دیں گے، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ایک معاملے میں اللہ نے اپنا فیصلہ سنا دیا ہے۔ پہلے تو ہم نے اس کو ماننا ہے۔ اس کے بعد ہم اس کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ جتنا سمجھ میں آ جائے، اچھا ہے۔ اللہ کے ہر حکم میں کوئی نہ کوئی حکمت ضرور ہوتی ہے، لیکن وہ پوری طرح ہماری سمجھ میں بھی آ جائے، یہ ضروری نہیں۔ ایسی چیزیں موجود ہیں جو پوری طرح انسانی عقل کی گرفت میں نہیں آتیں۔ اگر حکمت سمجھ میں نہ آئے تو یہ نہیں کہیں گے کہ ہم نہیں مانتے، بلکہ یہ ایمان ہونا چاہیے کہ ان اللّٰہ کان علیمًا حکیمًا۔ اللہ نے یہ بات اسی لیے کہہ دی ہے کہ اللہ زیادہ علم والا اور حکمت والا ہے۔ اللہ نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ تم اصل میں یہ طے ہی نہیں کر سکتے کہ کس رشتہ دار کا حصہ کتنا ہونا چاہیے۔

سوال: جب بیٹے اور بیٹیاں دونوں موجود ہوں تو منفعت کے اصول کے تحت ان میں فرق کرنا تو سمجھ میں آتا ہے، لیکن اگر بیٹے موجود ہی نہ ہوں اور صرف بیٹیاں ہوں تو پھر بیٹیوں کو کیوں کم حصہ دیا گیا ہے؟

جواب: اس کی وجہ یہ ہے کہ فی نفسہٖ بیٹوں سے جو منفعت ملتی ہے، وہ چونکہ بیٹیوں سے زیادہ ہے، اس لیے قرآن کہتا ہے کہ اگر صرف بیٹے ہیں تو سارا مال ان کو مل جائے گا، لیکن بیٹے موجود نہیں ہیں تو بھی فی نفسہٖ بیٹیوں کی منفعت چونکہ اس درجے کی نہیں ہے جو بیٹوں سے والدین کو ملتی ہے، اس لیے سارا مال بیٹیوں کو نہ دے دیا جائے۔ اگر ایک بیٹی ہے تو نصف اور اگر دو یا دو سے زیادہ ہیں تو دو تہائی ان کو دے دیا جائے۔ باقی مال کے بارے میں اس صورت میں قرآن یہ چاہتا ہے کہ بیٹیوں کے علاوہ جو دوسرے رشتہ دار ہیں، ان کو دینا چاہیے۔

سوال: بیٹی کو بیٹے کے مقابلے میں کم حصہ دینے کی وجہ کیا یہ نہیں کہ بیٹی جب بیاہ کر اگلے گھر چلی جائے

گی تو اس کو کچھ حصہ اپنے شوہر کے ترکے میں سے بھی مل جائے گا اور اس طرح ماں باپ سے ملنے والے تھوڑے حصے کی تلافی ہو جائے گی؟

جواب: سب سے پہلے غالباً علامہ اقبال نے یہ بات کہی کہ عورت کو چونکہ شوہر کی طرف سے بھی حصہ مل جاتا ہے، اس لیے اس کے حصوں میں توازن پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ اپنے حکم کا underlying principle قرآن نے خود بیان کیا ہے۔ قرآن یہ نہیں کہہ رہا کہ چونکہ خاتون کو اگلے گھر سے حصہ مل جائے گا، اس لیے یہاں اسے آدھا دے دو۔ ہوسکتا ہے آگے جا کر اس کو کچھ بھی نہ ملے۔ قرآن تو سادہ بات کہہ رہا ہے کہ آپ کو اپنے بیٹے سے جو منفعت دنیا میں عام حالات میں ملتی ہے، وہ چونکہ زیادہ ہے، اس لیے آپ کے مال سے اس کو حصہ بھی زیادہ ملنا چاہیے۔ بیٹی سے آپ کو جو منفعت دنیا میں ملتی ہے، وہ اس کے مقابلے میں کم ہے۔ اب وہ کتنی کم ہے، اس کی پیمایش کا ہمارے پاس کوئی معیار نہیں۔ اس لیے خود قرآن نے متعین کر دیا کہ تم نہیں طے کر سکتے کہ کتنا فرق ہے۔ خدا کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ بیٹے سے آدھی ہے، اس لیے تمھارے مال سے اس کو حصہ کم ملنا چاہیے۔ قرآن کی بات بالکل سادہ ہے۔ اسی کو حکم کا rationale بنانا چاہیے، بجاے اس کے کہ ہم وہ چیزیں بیان کریں جو یقینی نہیں ہیں اور جن کا خود قرآن نے ذکر بھی نہیں کیا۔

سوال: حدیث میں ہے کہ مرنے والے کو کسی وارث کے حق میں وصیت کرنے کا اختیار نہیں؟

جواب: ہر بات کا ایک پس منظر ہوتا ہے۔ قرآن نے جب پہلے وراثت کے بارے میں احکام دیے تو اولاد کو تو سب ہی دیتے تھے، لیکن اولاد کے علاوہ والدین یا دوسرے رشتہ داروں کو کچھ حصہ نہیں ملتا تھا تو قرآن نے پہلے مرحلے میں اس کا پابند کیا کہ جن لوگوں کی موت قریب ہو، مرنے سے پہلے ان پر لازم ہے کہ وہ ان سب کے حق میں وصیت کر کے جائیں، کیونکہ سوسائٹی میں جو دستور چلا آ رہا ہے، وہ یہ نہیں تھا۔ دستور یہ تھا کہ ساری جائیداد اولاد، بلکہ اولاد میں سے بھی صرف لڑکوں کو مل جائے۔ تو قرآن نے ہدایت کی کہ مرنے والا وصیت کر کے جائے کہ صرف اولاد کو نہیں، بلکہ میرے والدین کو اور دوسرے رشتہ داروں کو بھی اتنا اتنا حصہ ملے گا۔ ابتدا میں قرآن نے صرف اتنی بات کہی ہے۔

اس کے بعد اگلے مرحلے میں قرآن نے یہ کہا ہے کہ ملنا تو سب کو ہے۔ اولاد کو بھی ملنا ہے، بیوی کو بھی ملنا ہے، بہن بھائیوں کو بھی ملنا ہے، البتہ کس تناسب سے ملنا چاہیے؟ وہ خدا نے خود متعین کر دیا کہ اس تناسب سے حصے تقسیم کر دیے جائیں۔ اس تناظر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اب جب ورثا کے حصے خدا نے خود متعین کر

دیے ہیں تو اب کسی وارث کے لیے اس سے ہٹ کر کوئی الگ وصیت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان خدا کی تقسیم پر راضی نہیں، مثلاً خدا نے کہا ہے کہ بھائی کو اتنا ملے۔ اب کوئی آدمی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں تو بھائی کو اتنا دینا چاہتا ہوں۔ اب اس وارث کے حق میں وصیت کا حق اس کے پاس نہیں ہے۔ اس پس منظر میں یہ بات بالکل ٹھیک ہے۔ جس صورت کی ہم بات کر رہے ہیں، وہ اس سے مختلف ہے۔ اگر محض قرابت داری کے علاوہ کسی دوسری بنیاد پر، مثلاً کسی مخصوص وارث کی ضرورت اور احتیاج کے پیش نظر یا کسی اور معقول وجہ سے اس کے لیے مقررہ حصے کے علاوہ کوئی وصیت کی جائے تو یہ شرعی ممانعت کے خلاف نہیں ہوگا۔ چنانچہ دیکھیے، قرآن مجید نے سورۂ بقرہ کی آیت ۲۴۰ میں خود اس کی تاکید کی ہے کہ مرنے والے کو چاہیے کہ وہ اپنی بیوی کے بارے میں یہ وصیت کر کے جائے کہ اس کے مرنے کے بعد ایک سال تک اسے اسی گھر میں رہنے دیا جائے اور اسے سامان زندگی بھی فراہم کیا جائے۔ فقہا عام طور پر اس کے قائل ہیں کہ یہ ہدایت ترکے میں ورثا کے حصے متعین ہونے کے بعد منسوخ ہو گئی ہے، لیکن فقہا کو یہ راے اس لیے قائم کرنا پڑی کہ انھوں نے وراثت میں متعین حصہ ملنے کا مطلب یہ سمجھا کہ اب کسی زائد ضرورت کی بنا پر بھی کسی وارث کے لیے وصیت نہیں کی جا سکتی، حالانکہ قرآن کی یہ ہدایت ایک مستقل اصول پر مبنی ہے جس پر حصوں کی متعین تقسیم کا حکم اثر انداز نہیں ہوتا۔ قرآن نے بیوہ کے لیے ایک سال تک سامان زندگی کی وصیت کرنے کی ہدایت دراصل اس کی ضرورت و احتیاج اور مخصوص حالات کے پیش نظر دی ہے اور اس کے لیے یہ انتظام میت کے ترکے میں سے وراثت کے متعین حصے کے علاوہ ہی کیا جائے گا۔

قرآن کی اس ہدایت سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ رشتہ داری سے ہٹ کر ایسی اضافی وجوہ، مثلاً ضرورت و احتیاج ہو سکتی ہیں جن کے پیش نظر وارث کے حق میں معمول کے حصے کے علاوہ زائد مال کی وصیت بھی کی جائے۔ ضرورت احتیاج پر ہم خدمت کو بھی قیاس کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر مرنے والا اگر یہ چاہے کہ اپنے کسی دوست کے لیے وصیت کر جائے جس نے زندگی کے آخری ایام میں اس کی بڑی خدمت کی اور اس کے ساتھ بہت معاونت کی تو اس کو پورا حق ہے۔ یہ کسی رشتہ داری کی بنیاد پر نہیں، بلکہ اس کو اس سے جو فائدہ ملا، اس کے صلے کے طور پر ہے۔ جب کسی دوست کے لیے، کسی اجنبی کے لیے خدمت کی بنا پر وصیت کی جا سکتی ہے تو وہی خدمت اور وہی منفعت اگر رشتہ داروں میں سے کسی نے معمول کی ذمہ داریوں سے ہٹ کر کی ہو تو وہ کیوں اس کو اس کا مستحق نہیں بناتی کہ اس کے حق میں زائد وصیت کی جائے؟ آپ کا ایک بیٹا بیرون ملک چلا گیا۔ اس نے اس طرح سے آپ کی خدمت نہیں کی جیسے آپ کے ساتھ رہنے والے بیٹے نے کی ہے تو آپ کا یہ حق بنتا ہے کہ پاس رہ کر خدمت کرنے

والے بیٹے کے حق میں زائد وصیت کر دیں۔ رشتہ داری کی بنیاد پر سب بیٹوں کو یکساں حصہ ملے گا، اس لیے کہ بیٹا وہ بھی ہے، بیٹا وہ بھی ہے، لیکن خدمت کے صلے میں ایک بیٹے کو کچھ زائد دے دیا جائے تو یہ ایک بالکل معقول اور مبنی برانصاف بات ہوگی۔

گویا اصول یہ ہے کہ قرابت داری کے علاوہ اگر کوئی زائد وجہ ہے جو اس کا تقاضا کرتی ہے تو آپ ایسا کر سکتے ہیں۔ ایک بچے نے خدمت زیادہ کی ہے یا کسی بچے کے بارے میں آپ سمجھتے ہیں کہ وہ معاشی طور پر ذرا پیچھے رہ گیا ہے اور اس کو زیادہ ضرورت ہے تو اس کے حق میں وصیت کر سکتے ہیں۔ ہاں، عام حالات میں نہیں کر سکتے۔ اسی طرح اس اختیار کے غلط استعمال کا امکان بھی چونکہ موجود ہے تو کچھ نہ کچھ شرائط لگانی پڑیں گی۔ مثلاً آپ اس کا ایک کیس بنا کر جج کو بھیج دیں کہ یہ میرے فیصلے کی وجوہ ہیں اور میں اس بنیاد پر یہ وصیت کر رہا ہوں۔ جج اس کی توثیق کر دے تو ٹھیک ہے۔ معقول شرائط کے ساتھ کسی وارث کے حق میں وصیت کی گنجایش تسلیم کرنے کی بات حدیث کے منافی نہیں ہے۔

سوال: جو بیٹا ماں باپ کو چھوڑ کر بیرون ملک چلا گیا ہو، کیا اس کے حصے میں کمی کی جا سکتی ہے؟

جواب: جو بیٹا بیرون چلا گیا ہے، اس کے حصے میں کمی نہیں کی جا سکتی، اس لیے کہ وہ تو اس کو ملنا ہے بیٹا ہونے کی بنیاد پر۔ بیٹا تو وہ ہے ہی، الاّ یہ کہ نافرمان ہو اور اس نے رشتہ داری کے جو حقوق ہیں، ان کو پامال کیا ہو۔ پھر تو میرے نقطۂ نظر کے مطابق اسے محروم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر اس کا رویہ نافرمانی کا نہیں ہے، اس نے معمول کے تعلقات کو بحال رکھا ہے، اپنی بساط کے مطابق کچھ نہ کچھ آپ کی خدمت بھی کرتا رہا ہے تو پھر اس کو حصہ پورا ملے گا۔ دوسرے بیٹے کے حق میں، جس نے زیادہ خدمت کی ہے، وصیت کرنے کو پہلے بیٹے کے حصے میں کمی کرنا نہیں کہتے۔ حصہ تو اس کو برابر ملے گا۔ آپ کا یہ اختیار ہے کہ آپ اپنے مال میں سے ایک حصہ اپنی مرضی سے جس کو چاہیں، دے دیں۔ اس حق کو استعمال کرتے ہوئے آپ اس بیٹے کے لیے الگ سے وصیت کر جائیں۔ یہ حصہ دینے کے بعد جو مال بچ جائے گا، وہ سب ورثا میں برابر تقسیم ہو جائے گا۔

سوال: مرنے والے کو کس حد تک اپنے مال کے بارے میں وصیت کرنے کا اختیار حاصل ہے؟

جواب: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی کوئی قانونی حد تو بیان نہیں کی اور کوئی legal instruction آپ

نے نہیں دی، البتہ بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی خواہش یہ تھی کہ وصیت کا اختیار کم سے کم استعمال کیا جائے اور زیادہ سے زیادہ مال وارثوں کو ہی جانا چاہیے۔ ایک صحابی نے یہ خواہش ظاہر کی کہ میں سارا مال اللہ کے راستے میں دے دینا چاہتا ہوں۔ آپ نے اس کی اجازت نہیں دی۔ انھوں نے کہا کہ آدھے کی اجازت دے دیجیے۔ آپ نے نہیں دی۔ انھوں نے کہا کہ ایک تہائی کا اختیار تو دے ہی دیں۔ آپ نے فرمایا کہ ٹھیک ہے، لیکن ایک تہائی بھی بہت زیادہ ہے۔ اب یہ بات ایسے اسلوب میں بیان ہوئی ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے زیادہ کی اجازت دینے کو پسند نہیں کرتے۔ اس سے فقہا یہ حکم infer کرتے ہیں کہ ایک تہائی تک وصیت کا اختیار ہے، اس سے زیادہ نہیں۔ روایت میں یہ بات کسی قانونی حکم یا پابندی کے انداز میں بیان نہیں ہوئی، لیکن فقہا نے اس کو ایک قانونی شکل دے دی ہے اور اس پر کم وبیش ان کا اتفاق ہے کہ اس سے زیادہ مال کی وصیت نہیں کی جا سکتی۔ میرے نزدیک اگرچہ حدیث میں یہ تحدید قانونی انداز میں بیان نہیں ہوئی، لیکن فقہا کا استنباط غلط نہیں ہے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس اسلوب میں یہ بات ارشاد فرمائی ہے، اس سے لگتا ہے کہ ایک تہائی وہ زیادہ سے زیادہ مقدار ہے جس کی وصیت کیے جانے کو آپ نے گوارا کیا۔ تو اگرچہ یہ strictly legal نہیں ہے، لیکن بہرحال اس سے یہ منشا تو سمجھ میں آتا ہے کہ غیر ورثا کے حق میں وصیت کا حق کم سے کم ہی استعمال کیا جانا چاہیے اور زیادہ سے زیادہ مال ورثا کو جانا چاہیے۔

سوال: کیا نکاح کے وقت مرد کو چاہیے کہ وہ عورت کو طلاق کا حق تفویض کر دے؟

جواب: میں نے یہ نہیں کہا کہ یہ کوئی بہت آئیڈیل شکل ہے۔ میں نے یہ عرض کیا ہے کہ اس کی گنجایش ہمارے فقہا بہت شروع سے مان چکے ہیں۔ اس کی گنجایش موجود ہے کہ خاوند اپنا حق عورت کو دے دے۔ لڑکی نکاح کے وقت طلاق کا حق مانگ سکتی ہے، لیکن عام حالات میں یہ خاوند کی رضامندی سے مشروط ہے کہ وہ بیوی کو حق طلاق تفویض کرتا ہے یا نہیں کرتا۔ قانون اس کو پابند نہیں کرتا۔ لڑکی مطالبہ کرے تو شوہر کہہ سکتا ہے کہ میں یہ حق نہیں دیتا۔ ایسی صورت میں اگر مصلحت کا تقاضا ہو تو ریاست قانون کا اختیار استعمال کرتے ہوئے خاوند کو پابند کر سکتی ہے۔ قانون اس کا پورا اختیار رکھتا ہے کہ کسی بھی فرد کے حق کو restrict کر دے یا کسی بھی فرد کو ایسا حق جو عام طور پر اس کو حاصل نہیں ہوتا، مخصوص صورت حال میں وہ حق اس کو دے دے۔ تو اگر آپ ایک قانونی پابندی لگا دیں کہ ہر نکاح کے موقع پر خاوند اپنا حق طلاق ان ان شرائط کے ساتھ بیوی کو دے دے تو میرے نزدیک فقہی طور پر اس کی گنجایش موجود ہے۔

یہاں چونکہ بیوی کی طرف سے بھی اس حق کے غلط استعمال کا احتمال ہے اور یہ یقینی نہیں کہ ہر عورت اس حق کا استعمال انصاف سے ہی کرے گی، اس لیے کچھ شرائط بھی لگانی پڑیں گی۔ اگر آپ مطلق طور پر عورت کو حق طلاق دے دیں تو جو سوے استعمال آپ مرد کی طرف روکنا چاہتے ہیں، اس کا امکان عورت کی طرف بھی ہے۔ اگر خاتون کو آپ علی الاطلاق، بالکل absolute right دے دیتے ہیں کہ وہ جب چاہے، مرد سے الگ ہو جائے تو رشتہ نکاح کی وہ اصل ہیئت بھی قائم نہیں رہے گی جو اللہ نے قائم کی ہے اور غلط استعمال کی مثالیں بھی خواتین کی طرف سے زیادہ سامنے آئیں گی۔ اس لیے عورت کو حق تفریق کے استعمال کا موقع دینے میں کچھ نہ کچھ restrictions لگانا بہرحال ضروری ہے۔

اس سلسلے میں مثال کے طور پر یہ شرط لگائی جا سکتی ہے کہ بیوی اگر کسی موقع پر یہ مطالبہ کرے کہ مجھے طلاق چاہیے اور بیوی کا باپ یا سرپرست یا خاندان کا کوئی دوسرا ذمہ دار آدمی اس مطالبے کی توثیق کر دے کہ ہاں اس کا مطالبہ بجا ہے تو پھر خاوند پابند ہوگا۔ اسی طرح اس مشکل کے حل کے لیے مالکی فقہا کی رائے سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید نے سورۂ نساء کی آیت ۳۵ میں میاں بیوی کے مابین تنازع اور عدم موافقت کی صورت میں تصفیے کے لیے دونوں خاندانوں کی طرف سے جو حکم (Arbitrator) مقرر کرنے کی ہدایت کی ہے، ان کا دائرۂ اختیار صرف صلح کرانے اور میاں بیوی کو سمجھانے بجھانے تک محدود نہیں، بلکہ اگر اصلاح احوال کی پوری کوشش کے بعد وہ یہ محسوس کریں کہ میاں بیوی کے مابین نباہ نہیں ہو سکتا تو انھیں یہ بھی اختیار ہے کہ وہ دونوں کے مابین تفریق کر دیں، چاہے فریقین نے انھیں واضح طور پر اس کا اختیار نہ دیا ہو اور ان کے فیصلے کے نتیجے میں قانونی طور پر طلاق بائن واقع ہو جائے گی۔ مالکیہ کی یہ رائے فقہی طور پر اور عملی مشکلات کے تناظر میں بہت قابل غور ہے اور اگر اس کو قانونی شکل دی جا سکے تو ہمارے ہاں عام طور پر خواتین کو طلاق کے حصول میں جن بے جا رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس کا ایک معقول حل نکل سکتا ہے۔

سوال: اسلام میں خلع کا کیا تصور ہے؟ واضح فرما دیں۔

جواب: خلع یہ ہے کہ عورت کسی وجہ سے خاوند کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی اور وہ خاوند سے کہتی ہے کہ مجھے طلاق دے دو، جبکہ میں اتنا مال تمھیں دے دیتی ہوں۔ طلاق کے بدلے میں مالی عوض لینے کا جو جواز سمجھ میں آتا ہے، وہ یہ ہے کہ میاں بیوی کے مابین نباہ ممکن نہیں اور خاوند بھی یہ سمجھ رہا ہے کہ نباہ نہیں ہو سکتا، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ خاوند نے شادی بیاہ کے موقع پر یا اس کے بعد بہت سے تحفے تحائف بیوی کو دے رکھے ہیں اور وہ یہ سوچتا ہے کہ اب یہ

سارے کا سارا اس کے ساتھ ہی چلا جائے گا۔ اصولی طور پر تو جو کچھ وہ دے چکا ہے، وہ عورت کا ہو چکا ہے۔ شوہر اسے واپس لینے کا حق نہیں رکھتا، لیکن اگر نباہ نہیں ہو رہا اور جدائی کے فیصلے میں رکاوٹ صرف یہ دیا ہوا مال ہے تو قرآن اس موقع پر یہ ہدایت کرتا ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں کہ عورت نے جو کچھ لیا ہوا ہے، وہ واپس کر دے اور خاوند سے طلاق لے لے۔ فقہا اسی لیے یہ بات کہتے ہیں کہ خاوند کے لیے طلاق کے عوض کے طور پر اس سے زیادہ مال بیوی سے لینا پسندیدہ نہیں جتنا اس نے اس کو دے رکھا ہے۔

خلع میں یہ ہوتا ہے کہ عورت طلاق کا مطالبہ کرتی ہے۔ اگر تو معاملہ آپس میں ہی طے ہو گیا اور خاوند نے طلاق دے دی تو بات ختم ہو گئی۔ نہیں تو عورت قاضی کے پاس چلی جائے گی کہ میں طلاق لینا چاہتی ہوں، جیسے ایک خاتون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور کہا کہ میں اپنے خاوند کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاملہ طے کروا دیا کہ تم نے فلاں فلاں چیز جو خاوند سے لی ہے، وہ اس کو واپس کر دو اور خاوند سے کہا کہ تم اسے طلاق دے دو۔

سوال: نشوز سے کیا مراد ہے؟

جواب: نشوز کی کوئی متعین صورت شریعت نے نہیں بتائی۔ اس کی تعیین مختلف ثقافتوں کے لحاظ سے مختلف ہو گی۔ اس کو ایک سادہ مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ بخاری میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی روایت بیان ہوئی ہے کہ جب مہاجرین مکہ سے مدینہ آئے تو مکہ میں کلچر مختلف تھا اور بیوی کا مرد کی کسی بات پر اس کو retort کرنا یا اس کو جواب دینا بڑی معیوب بات سمجھی جاتی تھی۔ یہ بات گستاخی سمجھی جاتی تھی کہ خاوند نے ایک بات کی اور بیوی نے آگے سے اس کا جواب دے دیا۔ (گویا مکہ کے کلچر کے لحاظ سے یہ 'نشوز' تھا کہ بیوی اپنے خاوند کو ترکی بہ ترکی جواب دے۔) سیدنا عمر کہتے ہیں کہ ہم جب مدینہ آئے تو وہاں انصار کے ہاں ماحول مختلف تھا۔ عورتیں شوہروں سے بحث بھی کر لیتی تھیں، جواب بھی دے لیتی تھیں۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کے واقعات آپ حدیثوں میں پڑھیں، وہ بڑے دلچسپ ہیں۔ یہاں آ کر اختلاط ہوا اور ہماری عورتوں نے انصار کی عورتوں کے پاس آنا جانا شروع کیا، ان کے گھروں میں جا کر ان کا ماحول دیکھا تو جیسا کہ محاورہ ہے، خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑنے لگا اور ہماری خواتین نے بھی شوہروں کو جواب دینا شروع کر دیا۔

حضرت عمر اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن میں نے گھر میں کوئی بات کی تو میری بیوی نے اس پر آگے سے

مجھے جواب دے دیا۔ میں نے کہا کہ اچھا، نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے! تم یہاں کے ماحول میں آ کر بگڑ گئی ہو اور جواب دینا شروع کر دیا ہے۔ بیوی نے کہا کہ آپ ہمیں کیا کہتے ہیں، جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں دیکھیں۔ آپ کی بیویاں آپ سے بحث بھی کرتی ہیں اور آپ سے ناراض بھی ہو جاتی ہیں اور رسول اللہ کو منانا پڑتا ہے۔ حضرت عمر نے کہا کہ اچھا، یہ صورت حال ہے۔ میں پہلے جا کر اپنی بیٹی کی خبر لیتا ہوں۔ وہ گئے اور جا کر سیدہ حفصہ کو ڈانٹا اور کہا کہ تمھیں معلوم نہیں کہ تم کس کے گھر میں ہو؟ ان کو ڈانٹ پلا کر یہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس چلے گئے۔ حفصہ تو بیٹی تھیں، وہ ڈانٹ سن کر خاموش رہیں۔ ام سلمہ کے پاس جب گئے اور ان سے پوچھا کہ کیا تم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جواب دیتی ہو تو وہ ام سلمہ تھیں۔ انھوں نے کہا کہ تم کون ہوتے ہو دخل دینے والے؟ یہ ہمارا میاں بیوی کا معاملہ ہے۔ تم ہر معاملے میں دخل دیتے ہو، اب یہاں بھی آ گئے ہو!

'نشوز' (disobedience یا defiance) یہ ہے کہ جس معاشرے میں آپ رہ رہے ہیں، وہاں کے کلچر اور norms کے لحاظ سے یہ سمجھا جائے کہ ایک عورت اپنے شوہر کا جو مقام ہے، اس کی جو حیثیت ہے اور اس کی جو اتھارٹی ہے، اس کو چیلنج کر رہی ہے۔ اب اس کا عملی مصداق پاکستان میں کچھ اور ہوگا، افغانستان میں کچھ اور ہوگا اور امریکہ میں کچھ اور ہوگا۔ قرآن نے اس کے مصداق کو متعین نہیں کیا۔ عرف کے لحاظ سے جو چیز سرکشی سمجھی جائے اور یہ دکھائی دے کہ خاتون اس جگہ پر آ گئی ہے کہ خاوند کے رشتے کو یا اس رشتے کے واجبات کو تسلیم نہیں کر رہی اور سرکشی کا رویہ اختیار کر رہی ہے تو یہ نشوز کہلائے گا۔